اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

مئی ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۷ء/شعبان ۱۴۳۸ھ

مشمولات

O فکر و نظر

یامعشر العلماء — مدیر — ۴
دینی قوتوں کو خود احتسابی کی ضرورت

O تعلیم و تبیت

- اسلامیات کی تعلیم - نئی جہت کی تلاش — پروفیسر ملک محمد حسین — ۹
- تربیت کا مفہوم — ۱۱
- علوم کی اسلامی تشکیل نو (۲) — پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق عجمی — ۱۵
علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین - تقابلی جائزہ

O توہین رسالت

- مردان میں نظامِ عدل کی موت — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۰
- سانحۂ مردان کی مذمت بجا لیکن.... — ڈاکٹر محمد امین — ۲۳

O اسلام اور پاکستان

- جائیں تو جائیں کہاں؟ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۲۷
- پاکستان میں انتخابی معرکہ (دینی سیاسی جماعتوں کے لیے ایک تجزیہ) — ۳۱
- جعلی پیر اور جاہل مرید — پروفیسر عاصم حفیظ — ۳۷

O مغربی فکر و تہذیب

مغرب کا مشینی انقلاب — محمد عمران خان — ۳۹

O تزکیۂ نفس

معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ — احمد اعوان — ۵۰

O مطالعۂ کتاب

'تعلیم، امن اور اسلام' — مدیر و نائب مدیر — ۵۲

O کس قیامت کے یہ نامے

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے — ادارہ — ۵۸

فکر و نظر

یامعشر العلماء

اگر دینی قوتوں نے خود احتسابی کی روش نہ اپنائی اور اپنی اصلاح نہ کی تو فرد، معاشرے اور ریاست سے دین کی پسپائی اور مغربیت وجدیدیت کے غلبے اور خود ان کی ہزیمت اور رسوائی کو روکا نہیں جا سکتا

ہم نے اگست ۲۰۱۰ء میں جب البرہان کا اجراء کیا تھا تو اپنی اس پالیسی کا اعلان کیا تھا کہ ہم اس ملک میں علماء کرام اور دینی قوتوں کے حلیف ہیں، حریف نہیں۔ ان کے خادم ہیں، مخدوم نہیں۔

ان سطور کا راقم آثم تزکیۂ نفس کا ایک ادنیٰ طالب اور تلمیذ ہے اور اس نے اپنے مربی سے یہ سیکھا ہے کہ فروتنی وعاجزی اختیار کرنا ہے اور خبطِ عظمت میں مبتلا نہیں ہونا۔ بزرگوں کا ادب کرنا ہے کہ باادب بانصیب اور بےادب بےنصیب۔

اس کے باوجود ہم جو کہنے چلے ہیں وہ ہرگز نہ کہتے:

- اگر ہم ٹوٹا پھوٹا دین کا علم نہ رکھتے ہوتے
- اگر ملّت کا درد ہمیں مضطرب اور بےچین نہ کر رہا ہوتا
- اگر ہم یہ دیکھ نہ رہے ہوتے کہ دین اس ملک اور معاشرے سے پسپا ہو رہا ہے۔ دینی قوتیں کمزور اور شکست خوردہ ہیں اور مغرب کی لادین جمہوریت، سیکولرزم، لبرل ازم اس ملک اور معاشرے پر غالب آتے جا رہے ہیں۔
- اگر ہم یہ نہ جانتے ہوتے کہ اگر سیاسی قیادت بےراہ اور بےلگام ہو جائے تو صرف دینی قیادت ہی فرد، معاشرے اور ریاست کو فکری اور عملی زوال سے بچا سکتی ہے۔

لہٰذا اس ملک کی دینی قوتوں کا ایک حقیر جزو ہوتے ہوئے جب ہم اپنا (یعنی دینی قوتوں کا) محاسبہ کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

امّ الامراض: ہمارے تجزیے کے مطابق ہمارے ام الامراض دو ہیں: ایک عدم اخلاص اور دوسرے عدم فراست۔ ہمارے اندر عدم اخلاص اور عدم فراست کے امراض کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ یہ موضوع ایک الگ علمی مقالے کا تقاضا کرتا ہے جسے جلد البرہان میں شائع کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

ان دوامّ الامراض نے جن دیگر بہت سی بیماریوں کو جنم دیا ہے اور جنہوں نے ہمارے جسم وروح کو دیمک زدہ کر رکھا ہے ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ افتراق وتشتت اور عدم اتحاد

یعنی ہم متحد نہیں ہیں بلکہ افتراق وتشتت میں مبتلا ہیں۔ دیکھیے اتفاق واتحاد پیدا ہوتا ہے نظریے اور مقاصد کے اشتراک سے [۱] اور مخلص، نرم خو اور حکیمانہ قیادت سے [۲] ہم زبان سے تو دعوی کرتے ہیں کہ ہمارا نظریہ مشترک ہے یعنی ہم ایک ہی دین کے ماننے والے ہیں اور ہمارے مقاصد بھی مشترک ہیں یعنی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس دین کی تعلیمات پر عمل کرنا لیکن ہم اس پر عمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ گویا ہم نفاق میں مبتلا ہیں کہ جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس عدم اخلاص اور نفاق کا نتیجہ ہم میں سے ہر کوئی آج اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں آپس میں اتحاد نہیں کرتیں البتہ سیکولر جماعتوں سے اتحاد کر لیتی ہیں۔ ہم نے دین سکھانے کے لیے مدارس اور مساجد قائم کی ہیں لیکن ہم ان میں بھی متحد نہیں ہیں۔ اس کی وجہ عدم اخلاص کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ پھر ہم میں سے کس کو نہیں پتہ کہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے، اتحاد سے کامیابی ملتی ہے، لیکن اتنی موٹی سی بات بھی ہماری عقل میں نہیں آتی اور ہمیں متحد ہونے پر آمادہ نہیں کرتی تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم اخلاص کے ساتھ فراست سے بھی تہی دست ہیں۔

۲۔ فرقہ واریت اور مسلک پرستی

ہمارے اختلافات اجتہادی اور فروعی نوعیت کے ہیں جبکہ دین میں ہم مشترک ہیں۔ ہم عقائد میں مشترک ہیں۔ (یعنی توحید، رسالت، آخرت، کتاب، فرشتے تقدیر میں) ہم عبادات میں مشترک ہیں (یعنی نماز، روزے، زکوۃ اور حج کی ادائی میں ہم میں کوئی اختلاف نہیں) اخلاقیات میں بھی ہم میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم سب صدق، امانت، دیانت، عفت کو فضائل اخلاق اور جھوٹ، چوری، کرپشن، بددیانتی کو رذائل اخلاق میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح

---

[۱] وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ [آل عمران ۳:۱۰۳]

[۲] فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ [آل عمران ۳:۱۵۹]

معاملات میں بھی معیشت، معاشرت، قانون، تعلیم وغیرہ کے بارے میں جو اوامر و نواہی قرآن وسنت میں بیان کیے گئے ہیں، ہم ان کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ان سارے مشترکات کے ہوتے ہوئے بھی ہم پارہ پارہ ہیں کیونکہ ہم نے خدا اور سول کے حکم کو مسترد کرتے ہوئے اور اپنی بے عقلی و ہٹ دھری سے اپنے اپنے اجتہادی اور فروعی مسلک کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ ہم نے مسلک کے اختلاف کی وجہ سے اپنی اپنی مسجدیں الگ بنا رکھی ہیں، مدرسے الگ بنا رکھے ہیں، تبلیغی تحریکیں اور سیاسی جماعتیں الگ الگ بنا رکھی ہیں۔ اور ہم اکٹھے ہونے کو تیار نہیں۔ کیا ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ ہمارے ایمان، ہمارے اخلاص اور ہماری فراست کی نفی ہے۔ کیا ہمیں پتہ نہیں کہ مذہب اور مسلک دین نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ہم نے عملاً اپنے اپنے مسلک کو دین بنا رکھا ہے۔

۳۔ غیر متوازن تصورِ دین

دین کیا ہے؟ یہ قرآن وسنت میں مذکور ہے جو ہمارے دین کے متفقہ مآخذ ہیں۔ اور صحابہ وتابعین اور جمہور علماء امت نے ہمیں اس کی تفصیل بھی بتا دی ہے لیکن اس کے باوجود ہم دین میں افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنی مرضی سے اس کی ترجیحات تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہم دین کے کسی ایک جز کو بوجوہ کُل بنا کر پیش کرتے ہیں اور پورے دین کو اس میں محصور قرار دے دیتے ہیں مثلاً ہم میں سے کچھ دین کے سیاسی شعبے کی اصلاح کے لیے کام کرتے ہیں تو یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ کام ہی پورا دین ہے۔ ہم میں سے کچھ اپنے مدرسوں میں دین کی کچھ چیزیں پڑھا دیتے ہیں لیکن دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم پورا دین پڑھا رہے ہیں۔ ہم میں سے کچھ اصلاح وتزکیہ کی بات کرتے ہیں اور اپنے ذکر وفکر ہی کو پورا دین قرار دے کر دین کے دوسرے شعبوں سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر کنویں کے مینڈک ہیں لیکن اسے بحر اوقیانوس قرار دینے پر مصر ہیں۔

۴۔ عصری تقاضوں سے ناواقفیت

ہمارے اسلاف نے کہا تھا کہ ’من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل‘ یعنی جسے اپنے عصر کی ضرورتوں اور تقاضوں کا نہیں پتہ وہ عالم نہیں جاہل ہے۔ اور امام غزالی نے یونانی فکر وتہذیب کا مقابلہ کرنے کے لیے تہافتہ الفلاسفہ، لکھنے سے پہلے مقاصد الفلاسفہ لکھی تھی کہ پتہ تو چلے کہ ہمیں جس فکری چیلنج کا سامنا ہے وہ ہے کیا؟ لیکن جس مغربی فکر وتہذیب نے ہمارے زوال

کو مہمیز کیا، ہمیں غلام بنایا، جو آج بھی ہمارے فرد، معاشرے اور ریاست پر یلغار کیے ہوئے ہے بلکہ بڑی حد تک غالب آ چکی ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے اور برسرِ اقتدار طبقات اس کے سحر میں مبتلا ہیں لیکن ہماری فراست کا یہ عالم ہے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب ہوتی کیا ہے؟ کیا ہماری کسی مسجد میں اور کیا ہمارے کسی مدرسے میں مغربی فکر و تہذیب اور اس کے مآخذ کو ان کی زبان میں پڑھایا جاتا ہے؟ ہمارے علم کی حد تک سارے پاکستان میں ایک مدرسہ اور مسجد بھی ایسی نہیں؟ تو جب ہم جانتے ہی نہیں کہ ہمارا مخالف کہتا کیا ہے، تو ہم علمی میدان میں اس کا مقابلہ اور ردّ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے ایک پیشرو نے کہا تھا کہ ºLbøYŪvmnVırFDF,ŤU اور ہم کہتے ہیں تحدی الغرب ولا غزالی له.

۵۔ بے حسّی

ہم نے سطور بالا میں جو نقشہ کھینچا ہے کہ ہم فکری انتشار اور عملی زوال کا شکار ہیں، ہر شعبۂ زندگی میں شکست کھا رہے ہیں لیکن متحد ہونے کو تیار نہیں۔ ہم فرقہ واریت اور مسلک پرستی میں مبتلا ہیں۔ ہمارا تصورِ دین مخدوش ہے، ہم افراط و تفریط میں مبتلا ہیں اور ہم میں سے ہر کوئی اپنے پاس موجود جزو کو کُل دین قرار دینے پر مصر ہے اور اس میں کُل دین کو محصور سمجھتا ہے۔ اسلام اور اہل اسلام کو مغرب کی فکر و تہذیب کے غلبے اور بالادستی کا جو مہیب چیلنج درپیش ہے ہمیں اس کی خبر ہی نہیں اور نہ ہمیں اس کو جاننے کی کوئی فکر ہے۔ اور یہ سب ثمر ہے ہمارے عدمِ اخلاص اور عدمِ فراست کا۔

اور یہ ساری باتیں ایک حساس آدمی کی نیند اڑانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ اس کو بے چین اور مضطرب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ اصلاح پر ابھارتی ہیں، یہ علاج کا تقاضا کرتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم پر بے حسی طاری ہے۔ غیر اسلامی فکر و تہذیب کی یلغار ہمیں روندتے گزر رہی ہے لیکن ہم بے حس ہیں۔ ٹُک ٹُک دیدم دم نہ کشیدم والی کیفیت ہے۔ ہمارے سامنے فحاشی، عریانی، بے پردگی اور زنا کا سیلاب ہے، کرپشن، بد دیانتی، دنیا پرستی اور دولت پرستی عروج پر ہے۔ اس ملک میں ایک فیصد لوگ بھی قرآن سمجھ کر نہیں پڑھ سکتے۔ پانچ سات فیصد سے زیادہ نماز نہیں پڑھتے، ان کی بود و باش انگریزوں کی سی ہے۔ ان کی تعلیم ان کو فرنگی بنا رہی ہے۔ ہمارے حکمران طبقات امریکہ و یورپ کے آگے بِک چکے، نہ صرف وہ بک چکے بلکہ دینی طبقات بھی درجہ بدرجہ مغرب کی فکری اور تعلیمی غلامی قبول کر چکے.... ہم سب یہ ہوتا دیکھ رہے ہیں اور بے حس بیٹھے

ہیں۔ کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اپنے اپنے خول میں بند ہیں اور اس سے باہر نکلنے کو تیار نہیں۔ ہماری کیفیت اس شتر مرغ جیسی ہے جو طوفان آنے پر ریت میں سر دے لیتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

یا معشر العلماء، اے دینی سیاسی قائدین، اے مدارس کے مفتیو، تبلیغی و اصلاحی جماعتوں کے رہنماؤ! تمہیں خدا کا واسطہ... اٹھو..... کچھ دوا کا سوچو... کچھ دعا کرو.... اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کچھ تو کرو۔ کیا تم اس وقت کا انتظار کر رہے ہو کہ تمہارا حشر وہ ہو جو عاد وثمود کا ہوا؟ تمہارا حشر وہ ہو چنگیز خاں اور ہلاکو نے بلخ، بخارا اور بغداد کا کیا؟ بلکہ تمہارا وہ حشر ہونا شروع ہو چکا ہے۔ کیا تمہیں افغانستان کے کھنڈر، عراق کے اجڑے شہر، شام کی لاشے اگلتی سڑکیں اور وزیرستان کی اجڑی بستیاں نظر نہیں آتیں؟ تم کس دن کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا اس دن کا جب یہیں حشر برپا ہو جائے اور اعلان کر دیا جائے: فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ.

اساتذہ کی بے توقیری

علم اور اہل علم کی توقیر و تعظیم کے بغیر تعلیم و تدریس میں مقدار اور معیار کا ہدف کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ پڑھو پنجاب اور بڑھو پنجاب کا جو نعرہ خادمِ اعلیٰ پنجاب کی حکومت نے دیا ہے وہ تمام تر کوششوں کے باوجود نتیجہ خیز نہیں ہوگا کیونکہ تعلیم دینے والے بے وقار، بے بس اور کمی کمین بنا دیے گئے ہیں۔ وہ شخص جس سے عزت نفس، خود اعتمادی اور موقر و معزز ہونے کا احساس چھین لیا گیا ہو اور جس پر مالیہ اکٹھے کرنے والے اور مانیٹرنگ کے نام پر ریٹائرڈ کارپورل اور حوالدار نگران بنا دیئے گئے ہوں، وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے نئی نسل میں عزت نفس، خود داری، خود اعتمادی اور مئوقر و معزز ہونے کا احساس کیسے پیدا کرے گا؟ اقبال نے تو کہا تھا کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الہ الا اللہ

لیکن ہم عرض کریں گے کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل سیاست و افسر شاہی نے تیرا
کیسے آئے مدرسہ سے صدائے لا الہ الا اللہ

کیا خادم اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف ہماری اس نوائے دل خراش پر غور فرمائیں گے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

اسلامیات کی تعلیم۔نئی جہت کی تلاش

اس وقت اسلامیات کی تعلیم میں کچھ عقائد کا ذکر، کچھ عبادات کی تعلیم اور شاید کچھ معاملات کی تلقین کے ساتھ غزوات، فتوحات اور تعلقات کی شکل میں کچھ تاریخ کے اوراق پڑھائے جاتے ہیں۔قرآن حکیم کی چند صورتیں اور کچھ احادیث اور شاید کچھ دعائیں رٹوا دی جاتی ہیں۔اسلامیات کی اس طرح کی تدریس میں تدبر، تفکر اور عقل و شعور کے استعمال کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔نظام حیات، تصورِ زندگی اور تصورِ کائنات کا کوئی مربوط اسلامی نقطہ نگاہ پیدا نہیں ہوتا۔پہلی جماعت سے ماسٹر اور پی ایچ ڈی لیول تک اسلامیات کی تعلیم وتدریس کی یہی خامی ہے کہ ہمارے اسلامی فاضلین میں حکمت عنقا ہوتی ہے جو قرآن حکیم کے مطابق تعلیم کا آخری اور حتمی درجہ ہے۔قرآن حکیم میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض رسالت گنواتے ہوئے اللہ ربّ العزت نے تعلیم کا پہلا درجہ تلاوت آیات، دوسرا درجہ تعلیم کتاب اور تیسرا درجہ تعلیم حکمت بتایا ہے۔چوتھی بات یعنی تزکیہ نفس کا ذکر بھی ہے لیکن اس کا تعلق رویوں، عادات وحوار اور تقویٰ وطہارت سے ہے۔اگرچہ تزکیہ نفس بھی تلاوت آیات اور تعلیم کتاب سے ہی پیدا ہوگا لیکن اس کے لیے تفکر اور تدبر کے ساتھ رجحان وجذبہ کو زیادہ تحریک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلامیات کی تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا مقصد اسلامک ورلڈ ویو (Islamic World View) پیدا کرنا ہے جس کی بنیاد اسلام کا تصورِ الٰہ، تصور انسان اور تصور کائنات ہے اور یہ تینوں تصورات جب درست ترتیب اور درست امتزاج کے ساتھ مربوط ہوں گے تو اسلام کا جامع تصورِ حیات پیدا ہوگا۔علم کی دنیا میں تصورات مل کر نظریات کو جنم دیتے ہیں۔نظریات سے نظام اخذ ہوتا ہے اور نظام سے عملی اقدامات کی رہنمائی ملتی ہے۔اگر ہم انسانی زندگی اور اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھ کر تصورات (Concepts) کی فہرست بنائیں تو یہ فہرست کچھ اس طرح ہوگی۔

تصورِ توحید، تصورِ رسالت، تصورِ آخرت، تصور عبادت۔ ہماری نظر میں یہ اساسی تصورات ہیں جن میں تصورِ توحید سب سے بنیادی تصور ہے۔اور یہ اسلام کی بنیادی قدر بھی ہے کہ باقی تمام اسلامی اقدار توحید کی بنیادی قدر سے اخذ ہوتی ہے۔

ثانوی تصورات کی تفہیم سے ممکن ہے کہ اسلام کا نظریہ حکومت، اسلام کا نظریہ سیاست

اسلام کا نظریہ عدل، اسلام کا نظریہ تجارت، اسلام کا نظریہ بین الاقوامی تعلقات، اسلام کا نظریہ معیشت، اسلام کا نظریہ طبعی ماحول، اسلام کا نظریہ سائنس وٹیکنالوجی اخذ کیا جاتا ہے۔ اگر نظریہ (Theory) اخذ ہوجائے تو اس سے درج بالا شعبوں کے بنیادی اصول اور ان اصولوں پر مبنی عملی اقدامات یا لائحہ عمل بنایا جاسکتا ہے۔ ہماری نظر میں یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر اگر اسلامیات کی تعلیم وتدریس شروع سے آخر تک نئی نصابی ترتیب کے مطابق دی جائے خصوصاً ماسٹر، ایم فل اور پی ایچ ڈی لیول پر اس نقطۂ نگاہ کے مطابق کام کا آغاز کیا جائے تو تھوڑے عرصے میں ایک اسلامی علمی انقلاب برپا ہوتا نظر آئے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے اساتذہ کے مذاکرے اور ورکشاپس ہوں تاکہ اساتذہ کے اذہان تیار ہوں اور نئی طرز کا تعلیمی مواد بننا شروع ہوجائے۔ اس سارے عمل میں ہم قرآن وحدیث کی تعلیم اور عربی زبان کی تعلیم وتفہیم کو بنیادی آلے کے طور پر لیں گے۔

ایک اور نقطۂ نگاہ جو ہم پیش کرنا چاہیں گے وہ یہ ہے کہ اسلام کوئی زندگی سے کٹا ہوا دین نہیں اور نہ ہی اس کا علم باقی علوم سے جدا کوئی علم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام علم کے تمام شعبوں کا حصہ ہونا چاہیے۔ مثلاً فیکلٹی آف کامرس اینڈ بزنس میں تدریس کی بنیاد اسلام کا تصورِ تجارت وکاروبار ہونا چاہیے۔ شعبہ معاشیات کی تعلیم کا آغاز اسلام کے اصول معیشت، اسلام کے عدلِ اجتماعی وغیرہ سے شروع ہوکر جدید معاشی صورتوں اور اصولوں پر اطلاق تک پھیلا ہونا چاہیے۔ جتنے بھی سماجی علوم کے شعبے ہیں ان کی تعلیم وتدریس میں اسلامی تصورات اس طرح نفوذ کیے ہوئے ہونے چاہئیں جیسے انسانی جسم کے ہر حصہ میں دوڑتا ہوا خون۔ حتیٰ کہ طبعی علوم یعنی فزکس کیمسٹری، بیالوجی، فزیالوجی، جنٹیکس وغیرہ کی تعلیم میں بھی اسلامی عقائد، اقدار اور اللہ کی نشانیوں سے اخذ ہونے والے اصول کارفرما نظر آنے چاہئیں۔ تعلیم وتدریس اور تحقیق کا یہ تصور جو ہم دے رہے ہیں وہ کوئی راتوں رات زیر عمل آنے والا نہیں۔ ایک ارتقائی عمل (Evolutionary Process) کے ذریعے سے آہستہ آہستہ علم کی دنیا میں اس کا ظہور ہوگا لیکن اس کے بغیر اسلامی نظریہ کائنات کا ایک مربوط تصور کی حیثیت سے سامنے آنا ممکن نہیں ہے۔ ہم اسلامائزیشن آف نالج کی بہت بات کرتے ہیں۔ یہ کام بھی اسی ارتقائی عمل کے ذریعے ہوگا۔ ہم نے اسلامیات کی تعلیم وتدریس میں ایک رائے پیش کی ہے۔ ایک نقطہ نگاہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم اہل علم ودانش سے گزارش کرتے ہیں کہ ہماری ان گزارشات پر ذرا گہرائی سے غور فرمائیں۔ ہمارے نقطہ نگاہ میں اگر کوئی غلطی ہے تو نشاندہی فرمائیں اور اگر سمت درست ہے تو اس میں اپنے علم وفضل سے اضافہ فرمائیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تربیت کا مفہوم

تعلیم و تربیت کو اکٹھے بیان کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ تعلیم و تربیت ہم معنی ہیں۔ یہ کسی حد تک ہم معنی ہیں بھی لیکن کسی حد تک اشتراک معنی (Overlapping) کے باوجود ان میں فرق بھی ہے۔ دونوں الفاظ عربی زبان سے ہیں اور عرب یونیورسٹیوں میں کالج آف ایجوکیشن کو کلیۃ التربیۃ لکھا جاتا ہے۔ اگر ہم ایجوکیشن کو تعلیم کے معنوں میں لیں تو تعلیم اور تربیت ہم معنی شمار ہوں گے۔ ایجوکیشن کے ڈکشنری معنوں کے مطابق اس سے مراد تعلیم، تربیت، تہذیب سکھانا بہتری لانا، ہدایات دینا وغیرہ ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں میں علم کے ساتھ عملی اقدامات بھی شامل ہیں۔ مغربی فلسفیوںؒ نے تربیت کے جو مفاہیم بتائے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

افلاطون کہتا ہے کہ تربیت سے مراد جسم و روح کو سراپا جمال بنانا اور ان کو درجہ کمال تک پہنچانا ہے۔ ارسطو کے مطابق تربیت کی غرض و غایت یہ ہے کہ عقل کو حصولِ علم کے لیے تیار کیا جائے جس طرح زمین کھیتی باڑی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ جن ملٹن کے مطابق تربیت وہ جوہر ہے جو انسان کو ہر کام کا اہل بنا دیتی ہے۔ اور طبیعت میں گہرائی اور سوجھ بوجھ پیدا کرتی ہے خواہ زمانہ امن کا ہو یا جنگ کا۔ پستالوزی کے مطابق تربیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو حیاتِ کاملہ برتنے کا گر سکھایا جائے۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ تربیت کا مدعا یہ ہے کہ بچہ کو قوائے ذہنی کی نشوونما کا پورا موقع دیا جائے۔ صلی (Sulluy) جو نفسیات اور تربیت کا ماہر استاد تھا کہتا ہے کہ تربیت بچے کی طبیعت سنوارتی ہے تا کہ وہ نیکی اور صدق پر مبنی زندگی گزار سکے۔ کانٹ کے مطابق تربیت سے مراد یہ ہے کہ انسان ممکن حد تک کمال کا درجہ حاصل کرے۔ ڈیوڈ ہیل کے مطابق تربیت کاملہ وہ ہے جو انسان کی جسمانی صحت محفوظ رکھتی ہے اور قوتِ بدنیہ کو سنوارتی ہے، جو اس کے قوائے عقلی و جسمانی کی نگہداشت کرتی ہے۔ تیزیٔ فہم پیدا کرتی ہے اور ذکاوت ادراک بڑھاتی ہے۔ فکر و نظر میں گہرائی پیدا کرتی ہے۔ شعور میں نزاکت اور جلا پیدا کرتی ہے جن کے نتیجے میں انسان اپنے فرائض ضمیر کی روشنی میں ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

درج بالا مغربی مفکرین کی آراء کو مربوط کرتے ہوئے مشہور مصری ماہر تعلیم پروفیسر عطیہ محمد الابرشی نے تربیت کی یوں تعریف کی ہے:

''تربیت انسان میں کامل معیار کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔اس سے بہرہ ور ہو کر انسان اچھی زندگی بسر کرتا ہے۔وطن کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔جسم مضبوط و توانا ہوتا ہے۔اخلاق میں کامل اور یکتا ہوتا ہے۔اس کی فکر میں نظم وضبط ہوتا ہے۔اس کا شعور نازک اور حساس ہوتا ہے۔وہ اپنے کام میں ماہر اور سبک دست ہوتا ہے۔دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراک کرتا ہے۔اس کے قلم اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ جچی تلی اور موزوں اور مناسب ہوتی ہے۔وہ جو کام کرتا ہے خوبی اور خوش اسلوبی سے کرتا ہے۔اگر ہم تربیت کاملہ سے مذکورہ اغراض ومقاصد حاصل کر لیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ طبی ، جسمانی، عقلی، وجدانی ،عملی ، اجتماعی، جمالی،لغوی ہر قسم کی تربیت حاصل ہوگئی اور انسان، انسانِ کامل بن گیا۔''

اوپر دی گئی مغربی مفکرین کے تربیت کے متعلق خیالات اور پروفیسر عطیہ الابراشی کی سب کو مربوط کرنے والی تفصیلی تعریف پر نظر ڈالی جائے تو ذہنی تشنگی دور نہیں ہوتی ۔خصوصاً ایک مسلمان معلم کے لیے ان تعریفوں کی روشنی میں کوئی تربیتی لائحہ عمل ترتیب دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ہوسکتا ہے کہ بعض دیگر اساتذہ ان سے کوئی روشنی حاصل کریں لیکن میں ایک مدرس کی حیثیت سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں کہ کوئی موزوں لائحہ عمل بنا سکوں۔

میں اس مقصود کے لیے قرآنِ حکیم کی طرف نظر کرتا ہوں تو مجھے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ روشنی کی یہ کرن اُن آیات مبارکہ سے عیاں ہے جن میں اللہ ربّ العزت نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بطور رسول کے فرائض کی تصریح کی ہے۔کم از کم چار مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض رسالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے (مفہوم) کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس کرتے ہیں۔ساتھیوں کو وہ کچھ بتاتے ہیں جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے۔مذکورہ بالا فرائض رسالت میں تلاوت آیات سے مراد تو قرآن مجید کے متن (Text) کی تعلیم ہے۔تعلیم کتاب سے مراد قرآن حکیم کا فہم ہے۔وہ فہم جو اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو القا ہوا اور جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منتقل کیا۔

تعلیم حکمت سے مراد فہم قرآن کا زندگی کے عملی معاملات ومسائل پر اطلاق ہے۔ فہم قرآن وہ روشنی ہے، وہ صلاحیت ہے اور راست فکر ہے جو معاشرتی، معاشی، قومی بین الاقوامی حال اور مستقبل میں پیش آنے والے معاملات اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا و مرضی کے مطابق حل کرنے کے لیے رہنمائی کرتی ہے۔ حکمت کی قرآنی اصطلاح بڑی وسیع المعنی ہے لیکن اس وسعت کی تحدید قرآن وسنت سے حاصل ہونے والی ذہنی تربیت اور فکر وتدبر سے ہوتی ہے۔ چوتھی بات جو فرائض رسالت میں گنوائی گئی وہ تزکیہ نفس ہے۔ تزکیہ نفس پر جید علمائے کرام نے قرآن وسنت کی روشنی میں وقیع کتابیں لکھی ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ہم اسے تربیت کے مفہوم میں لیتے ہوئے یہ کہیں گے کہ طالب علم میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کاملہ (جس کی بنیاد، تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت ہوگی) کے جذبہ کے تحت سوچ، رویوں، عادات اور اعمال کی تشکیل کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرے۔ تقویٰ کی آسان تعریف بعض صحابہ کرام کے حوالے سے یوں آئی ہے کہ ''آپ کانٹوں بھری جھاڑیوں کے جنگل سے گزر رہے ہوں اور جس طرح اپنے دامن کو کانٹوں میں الجھنے سے بچائے ہوئے گزرتے ہیں اسی پر قیاس کرتے ہوئے اس گناہ آلود دنیا میں رہتے ہوئے اپنا دامن گناہوں سے بچا کر رکھیں تو گویا آپ تقویٰ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے قرآن حکیم میں تفکر، تدبر، تعقل، اور شعور کی تربیت پر بڑا زور دیا گیا۔ ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے ہم تربیت کی جو تعریف کریں گے وہ اس طرح سے ہے:

تعلیم کے ساتھ تربیت کے اہتمام کی وجہ سے طالب علم:

۱۔ ہر کام اور ہر عمل میں پوچھے گا اور جانے گا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کیا ہے۔

۲۔ اچھے بُرے میں تمیز کرے گا۔ اچھائی کو اختیار کرنے میں پُر جوش اور برائی سے اجتناب کرنے میں حساس ہوگا۔

۳۔ ہر حال میں سچ بولے گا۔ امانت ودیانت کا اعلیٰ معیار قائم کرے گا۔ حقوق وفرائض کی ادائیگی میں پہل کرے گا۔

۴۔ حرام سے بچے گا اور حلال کی خواہش رکھے گا۔ حلال سے محرومی کی صورت میں صبر کرے گا لیکن حرام کی طرف مائل نہیں ہوگا۔

۵۔ عاجزی، انکساری اور احترام بزرگان کے جذبے سے سرشار اپنے اندر وقار اور عزتِ نفس سے بھی مالا مال ہوگا۔

۶۔ خود اعتماد، گفتگو کے فن کے واقف، مکالمے پر یقین رکھتے ہوئے دوسروں کو متاثر کرنے کے فن سے واقف ہوگا۔

۷۔ مشکل حالات میں پرسکون اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت لیے ہوئے خوشگوار طبیعت کا حامل ہوگا۔

۸۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے دوسروں کی عملی معاونت اور ان سے ہمدردی کرنے پر ہر وقت تیار رہوگا۔

۹۔ الفاظ کے چناؤ میں محتاط اور دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنے والا ہوگا۔

۱۰۔ جسمانی طور پر تنومندی اور ذہنی طور پر چستی اور حاضر جوابی کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے والا ہوگا۔

۱۱۔ اپنے دین سے محبت، اپنے وطن سے محبت، اپنے لوگوں سے محبت اور سب سے بڑھ کر اللہ کی مخلوق سے محبت اس کی سرشت کا حصہ ہوگا۔

سطورِ بالا میں ہم نے وہ رویے، وہ عادات اور سوچ کے وہ زاویے دینے کی کوشش کی ہے جو تربیت کے ذریعے طلبہ میں پیدا کیے جانے چاہئیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ وہ کس قسم کا تربیتی نظام اور تعلیمی ماحول ہوگا جس سے ہمیں گوہر مطلوب ہاتھ آ سکتا ہے؟ اگلی کسی کوشش میں ہم اس کے لیے ایک تفصیلی لائحہ عمل دیں گے لیکن اہل علم و فضل سے بھی گزارش ہے کہ وہ ہماری اور ملت اسلامیہ کے مربیین کی رہنمائی فرمائیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق عجمی ﴿۱﴾

علوم کی اسلامی تشکیلِ نو (۲)

علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے افکار کا تقابلی مطالعہ

اقبال کے ذہن میں ایک ایسی تجربہ گاہ، درسگاہ یا دارالعلوم کا ایک خاکہ موجود ہے جہاں تجلیات کلیم اور مشاہدات حکیم کی روح کو سموئے ہوئے نظام تعلیم کا اہتمام کیا جا سکتا ہے:

''اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا، حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دارالعلم کی ضرورت میں شک اور شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ دارالعلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمانوں کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جس کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قوم تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔'' ﴿۲﴾

اقبال اپنے مجوزہ قومی تعلیمی مرکز یا مثالی اسلامی درسگاہ یا یونیورسٹی کو جن قومی مقاصد کے حصول کے لیے قائم کرنے کے خواہش مند ہیں اور اس کو جس نصب العینی اساس پر استوار کرنا چاہتے ہیں، وہ علمی و دینی منہاج بھی ان کے ذہن میں پوری طرح سے روشن ہے۔ وہ علی گڑھ کالج، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما کے تعلیمی تجربات کی شیرازہ بندی چاہتے ہیں اور ایک ایسے مرکزی دارالعلوم کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جہاں افراد قوم مخصوص تعلیمی و تہذیبی اسلوب کے حامل کے طور پر عصر حاضر کے معیارات پر پورے اتر سکیں۔

''یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی

﴿۱﴾ جی سی یونیورسٹی لاہور۔ یہ بحث پروفیسر صاحب کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ایک جزء ہے۔

﴿۲﴾ مقالات اقبال، ص: ۱۷۵

تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔''(١)

ممکن ہے کہ ایک صدی پیشتر جبکہ اقبال بڑے کھلے ذہن کے ساتھ ''جدید'' کی اصطلاح استعمال کررہے تھے، اور وہ بھی علوم کے حوالے سے بعض اذہان اس سے متوحش ضرور ہوتے ہوں کیونکہ ایک صدی گزرجانے کے باوجود آج بھی روایت پسندی، جدید اور جدیدیت سے کلی طور پر مانوس نہیں ہو پائی اور اس کے ساتھ اگر کھلی مخاصمت کا اظہار نہیں بھی کر پاتی تو اس سے کچھ فاصلے پر رہنے کی پالیسی پر ضرور عمل پیرا ہے۔

اقبال کی سوچ اس حوالے سے ابہام سے پاک ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے اور پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں علوم وفنون کا چرچا مسلمانوں کی قائم کردہ درسگاہوں کا مرہون منت تھا اور اگر کوئی متعصب مغربی ذہن اسلام اور علوم کے درمیان کسی قسم کی مغائرت پر اصرار کرتا ہے تو وہ یقیناً بےخبری کا شکار ہے کیونکہ علوم جدیدہ کی بنیاد جن اصولوں پر استوار ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں اور اسلام نے انسانی زندگی پر گہرے اور مثبت اثرات مرتب کیے ہیں۔(٢)

اقبال کے پیش نظر مجوزہ مثالی درسگاہ کا جو نقشہ تھا اور وہ اس میں دینی، سائنسی اور عمرانی علوم کے جس امتزاج کا تصور اپنے ذہن میں قائم کیے ہوئے تھے، اس کی نصاب سازی کی مشکلوں اور پیچیدگیوں سے بھی وہ آگاہ تھے لیکن ابتدائی طور پر اس کی طرف واضح اور بلیغ اشارے ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں علوم اسلامیہ کے شعبے کے قیام کے فیصلے کے بعد انہوں نے جو تفصیلی تجاویز پیش کیں، اس سے نصاب سازی سے متعلق ان کے موقف کی بڑی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے۔

شعبہ علوم اسلامیہ کے قیام کے لیے سر آرنلڈ کی زیر نگرانی درج ذیل بنیادی مقاصد کا تعین کیا گیا:

١۔ بہتر اور مسلمہ جامعیت کے علما وفقہا کی تیاری، تعلیم اور تربیت کا اہتمام۔

٢۔ ایسے عالم پیدا کرنا جو اسلامی افکار اور موجودہ علوم کے درمیان حیات دماغی کا جو تسلسل

(١) مقالات اقبال، ص:١٧٦

(٢) ایضاً، ص:٢٨٠، ٢٨١

پایا جاتا ہے، اس کی از روئے نشو و نما جستجو کریں۔

۳۔ ایسے علماء تیار کرنا جو اسلامی تاریخ، آرٹ (فنون) اور علم تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوں۔

۴۔ ایسے علما پیدا کرنا جو اسلام کے قانونی لٹریچر میں تحقیق و تدقیق کے لیے موزوں ہوں۔[۱]

مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے سر آرنلڈ نے مختلف امتحانی مدارج کے لیے درج ذیل نصاب تجویز کیا تھا:

① معمولی بی۔اے کی ڈگری کا نصاب

۱۔فرقہ جات اسلام　۲۔اسلام کا سیاسی نظریہ　۳۔اسلامی علم الانساب

② بی۔اے (آنرز) کی ڈگری کا نصاب

۱۔فرقہ جات اسلام　۲۔اسلام کا سیاسی نظریہ　۳۔اسلامی علم الانساب

۴۔اسلام کا دیگر مذاہب سے رشتہ یا سلوک.... رواداری و عدم رواداری

③ ایم۔اے کی ڈگری کا نصاب

۱۔اسلامی اصول فقہ کی ابتدا اور ان کا ارتقا　۲۔مسلمانوں کا فلسفۂ اخلاق و مابعد الطبیعیات

۳۔عالم اسلام میں سائنس کا درجہ　۴۔ڈپلومیسی (حیل سازی) متعلق بہ ممالک غیر اسلامی

۵۔عالم اسلام پر بیرونی اثرات۔[۲]

اقبال نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے نام اپنے طویل خط میں تفصیل سے مجوزہ نصاب کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے بعض تحفظات کا اظہار بھی کیا اور ساتھ ہی دینی اور مختلف شعبہ ہائے علوم کے نصاب کی تدوین اور تطبیق سے متعلق اپنے واضح موقف سے بھی آگاہ کیا۔

---

[۱] صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے نام لکھے گئے اقبال کے طویل خط میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مجوزہ شعبۂ علوم اسلامیہ کے مقاصد اور نصاب سے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔ دیکھیے کلیات مکاتیب اقبال، ۲/ ۴۳۶، ۴۳۷

[۲] سر آرنلڈ کے مجوزہ نصاب سے متعلق تفصیلات پروفیسر بختیار حسین صدیقی کے مضمون ’’اقبال: مثالی دار العلوم کا تصور‘‘ میں موجود ہیں۔ دیکھیے مجلہ اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۹ء، ص: ۲۷، ۲۸۔ بیشتر معلومات محمد حسین خان زبیری کی تالیف، مشاہیر کے تعلیمی نظریے‘‘ (باب ۲۱ علوم اسلامیہ) جاوید پریس، کراچی (س۔ن) ص: ۲۷۱ سے اخذ کی گئی ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر بالخصوص جدید دنیائے اسلام میں انسان دوستی (Humanism) کی تحریک اور بیداری کے نقطۂ نظر سے غور کیا جانا چاہیے کیونکہ زندگی کے ساتھ ساتھ ملت کی روحانی ضرورتوں میں بھی تغیر رونما ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرد کی ذہنی وفکری آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی کے نتیجے میں جدید زندگی کی اساس ہی تبدیل ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ ازمنہ وسطی کا دینی اور کلامی علم آج کے مسلمان کی طمانیت قلب کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق کرنا مشکل ہے کیونکہ قدیم طرز پر علم دینیات کے شعبے کا قیام میرے نزدیک غیر مفید ہے۔ اس سے مذہبی روح کی حوصلہ شکنی مراد نہیں لیکن اگر اجتہادی گہرائیوں کا حصول پیش نظر ہے تو پھر اسلامی فکر کی تشکیل نو ہمارا مقصود ہونا چاہیے۔ عصری مسائل کے لحاظ سے دینیات کا قدیم تر نصاب فرسودہ ہو چکا ہے جس کی آج کوئی قدر و وقعت باقی نہیں رہی لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک نئے علم کلام کی تشکیل کے لیے ایسے عالم تیار کیے جائیں جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں۔

اقبال کے خیال میں دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد سے استفادے کی صورت پیدا کی جانی چاہیے۔ وہاں کے دینی علوم کے ماہرین کو آرنلڈ کے مجوزہ مکمل نصاب کی بجائے جدید علمی اور سائنسی افکار کی تعلیم دیا جانا مفید ہو سکتا ہے اور اس کے بعد ان کو مجوزہ نصاب کے مطلوبہ مضامین مثلاً فقہی مکاتب، اسلامی اخلاقیات اور فلسفہ و مابعد الطبیعیات پر لیکچرز سننے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور بعد ازاں ان کو دینیات، کلام اور تفسیر پر مجتہدانہ خطبہ دینے کے لیے یونیورسٹی فیلوشپ پیش کی جائیں چنانچہ ایسے ہی تربیت یافتہ علما کی بدولت دینیات کا شعبہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

دیوبند اور لکھنؤ سے متعلق جو لوگ سائنسی میلان کے حامل ہوں، ان کو فلسفہ، سائنس اور ریاضیات کی مکمل تعلیم دی جانی چاہیے جس کے بعد ان کو سر آرنلڈ کے کورس کے مطلوبہ مختصر حصے کی تعلیم دی جائے اور ان کو سائنسی ریسرچ پر مامور کرنے کے لیے یونیورسٹی فیلو بنا دیا جائے۔

آرنلڈ کا مکمل کورس صرف ان لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے جو فلسفہ و سائنس سے شغف نہ رکھتے ہوں اور مسلم تہذیب اور تمدن کے اصول تعلیم کا عمل حاصل کرنے کے آرزو مند ہوں۔ البتہ ان کے کورس میں بھی مسلم آرٹ اور فن تعمیر کی تعلیم شامل کی جانی چاہیے۔

قانون کا ذوق رکھنے والے ذہین اور طباع لوگوں کو اصول قانون سازی کی تعلیم دی جائے

کیونکہ آج قانون محمدی کی تعمیری تشکیل کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔اس ضمن میں اقتصادیات اور عمرانیات کی جامع تعلیم کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی ہے۔قانون کی تعلیمی تکمیل کے بعد ان کو آرنلڈ کے کورس کے صرف ان حصوں کے لیکچرز سننے کی ضرورت ہوگی جو اسلامی نظریہ سیاست، اصول فقہ کا ارتقاوغیرہ سے متعلق ہوں گے۔اس کے بعد ان میں سے جو چاہیں وکالت کا پیشہ اختیار کرلیں یا قانونی ریسرچ کے لیے خود کو وقف کردیں، وہ ہر صورتوں میں عدالت اور کونسل کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ (۱)

اقبال کی نصابی تجاویز کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ جہاں تعلیمی عمل میں طالب علموں کے رجحانات کو پیش نظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں وہیں وہ بدلتے ہوئے حالات میں عصری اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کو بھی اس کا لازمی حصہ بنانے پر زور دیتے ہیں تا کہ فکر اسلامی کی تشکیل نو میں اجتہادی روح اور نور بصیرت جاری وساری ہوسکے۔

اقبال کے نزدیک تعلیم کا دو کیمپوں میں تقسیم ہوجانا جہاں علمی زوال کا ایک اہم سبب بنا وہیں اس نے ایسے المیوں کو بھی جنم دیا جس کے نتیجے میں تہذیبی وحدت بھی قائم نہ رہ سکی اور اس کے تشخص کے لیے بھی نئے نئے خطرات ابھر کر سامنے آتے رہے۔لہٰذا علمی وتہذیبی زوال سے نجات کے لیے جو بنیادی قدم اٹھایا جانا چاہیے وہ تعلیمی ترقی کا حصول ہے جس کے لیے دینی اور سائنسی علوم کی ثنویت پر مبنی غیر علمی اور غیر اسلامی سوچ اور رویوں کا مٹانا از حد ضروری ہے۔

خواجہ غلام السیدین کے نام لکھا گیا اقبال کا درج ذیل خط گویا مذکورہ مسئلے کے حل کے لیے ایک مؤثر اور بلیغ اشارے کی حیثیت رکھتا ہے:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔اس علم سے ایک طبیعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔یہ علم،علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے ''جاوید نامہ'' میں لکھا ہے۔

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور　　آخر او می نگنجد در شعور

(جاری ہے)

(۱) کلیات مکاتیب اقبال، ۲/ ۴۴۳، ۴۳۸

توہین رسالت

پروفیسر عاصم حفیظ[۱]

مردان میں نظامِ عدل کی موت

مردان یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا کوئی بھی اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ کوئی ہجوم کسی بھی وجہ سے کسی کی جان لے لے۔ ایسی روش کسی بھی معاشرے کے لئے تباہ کن ہوتی ہے کہ جب عوام میں یہ تاثر پیدا ہو جائے کہ انصاف صرف وہ خود ہی چھین سکتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ ہمارے نظام عدل کی موت ہے۔ مردان یونیورسٹی میں سیکڑوں طلبا کے درمیان پڑی مشال کی لاش دراصل ہمارے نظام قانون و انصاف کی میت ہے۔ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اس لڑکے کو مارنے والی ویڈیوز یقیناً افسوسناک ہیں لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ وہ ساری پوسٹیں اور سوشل میڈیا پر اس کی جانب سے شیئر کیا گیا مواد بھی عام ہو چکا ہے جس میں وہ مذہب، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور دیگر مقدس ہستیوں کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار میں ساری حدیں توڑتا رہا ہے۔ مشال کو مارنے والوں نے کچھ اچھا نہیں کیا، لوگ اسے انتہا پسندی کہتے ہیں لیکن یہ بتاتے ہوئے بھی دکھ ہوتا ہے کہ خود مشال بھی اپنے خیالات کے حوالے سے توہین آمیزی میں ایک دوسری انتہا پر کھڑا تھا۔ ذات باری تعالی کا مذاق اڑانا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادیوں کو لے کر توہین آمیز ریمارکس دینا، طواف کو بیوقوفوں کے چکر کہنا، جنت کے حصول کو ''مقدس عیاشی'' قرار دینا، نظریہ پاکستان کو پاگل پن اور سمندر میں غرق شدہ قرار دینا۔ یہ باتیں کسی بھی گئے گزرے مسلمان کو بھی مشتعل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ روس سے پڑھ کے آیا تھا، کیمونزم کا زبردست حامی اور مبلغ تھا لیکن اپنے نظریات کا پرچار کرتے کرتے اللہ تعالی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر مقدس ہستیوں اور عبادات کی توہین کر کے خود کو سکالر ثابت کرنے کا شوق چرایا تھا۔

یہ ساری پوسٹیں اور اس کا سوشل میڈیا پر شیئر ہونے والا مواد اب عام ہو چکا ہے۔ کاش ہمارے ہاں کوئی ایسا نظام ہوتا کہ جو اس بدترین واقعے سے پہلے ہی روک تھام کا بندوست کر لیتا۔

---

[۱] asimmas27@gmail.com

کوئی تو ہوتا کہ جو مشال کو سمجھا تا کہ توہین آمیز رویہ کچھ اتنا بھی قابل تعریف نہیں ہوتا۔ انسان گناہ گار بھی ہوتا ہے اور بہت سے لوگ بعض نظریات میں اپنا الگ موقف بھی اپناتے ہیں، لیکن توہین آمیز کلمات شئیر کرنا اور تضحیک اور مذاق کی روش کبھی کبھی خطرناک بھی ہو جایا کرتی ہے۔ ہمارے ارباب اختیار کو سوچنا ہوگا کہ یہ سوچ کیونکر پیدا ہو رہی ہے کہ توہین اسلام یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کے بارے انتہائی غلیظ ترین الفاظ استعمال کرنے والوں کو کوئی بھی قانون نہیں پکڑ سکتا ۔ جو چاہے دھڑلے سے اسلام پر تنقید کرے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاکے بنائے، مزاحیہ کارٹون اور جملوں کے ذریعے مقدس ہستیوں کو نشانہ بنائے، جو دل میں آئے وہ کرے، کوئی بھی قانون اس تک پہنچ نہیں سکتا اور اگر پہنچ بھی گیا تو میڈیا، ایوان سیاست، پارلیمنٹ اور پوری حکومتی مشینری اس کی حمایت میں کھڑی ہوگی۔ اس کو بہت جلد رہائی ملے گی اور ساتھ میں کسی خوشحال مغربی ملک کا ٹکٹ بھی۔ اسے پوری حفاظت کے ساتھ کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔ پیچھے رہ جائیں گے حکومتی عہدیداروں کے کھوکھلے بیانات اور اگر کسی بیچارے جج نے اس بارے میں کچھ کہہ بھی دیا تو اس کے خلاف بھرپور مہم چلا کر اسے بدنام کر دیا جائے گا اور بہت جلد سب بھول جائیں گے کہ کوئی ایسا واقعہ ہوا بھی تھا کہ نہیں۔

المیہ تو یہ بھی ہے کہ ایک طرف گمراہ عناصر جنت کے لالچ میں ہمارے نوجوانوں کو خودکش بمبار بنا رہے ہیں تو دوسری جانب دنیاوی جنت کے لالچ اور بیرون ممالک کی شہریت کے لالچ میں لوگ توہین مذہب، توہین رسالت اور ملک کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ جی ہاں اس بارے میں ٹھوس اقدامات کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ تاثر ختم کیا جا سکے کہ توہین کا سہارا لیکر آپ ملک کے سیکولر حلقوں کی آنکھ کا تارا بن جائیں گے۔ آپ کو مذہب بیزار قوتوں کی جانب سے سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ عالمی طاقتیں آپ کی حمایت میں کھڑی ہوں گی، خوشحال مغربی ممالک ویزے اور شہریت لے کر استقبال کریں گی۔ سیکولر حلقوں کو بھی سوچنا ہوگا کہ وہ اپنے نظریات کے پرچار کرنے والے جوشیلے جوانوں کو سمجھائیں کہ توہین آمیز رویہ اپنانا گویا آگ سے کھیلنا ہے۔ دوسری جانب مذہبی حلقوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جہاں توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور توہین اسلام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں وہیں تحمل، بردباری اور صبر و برداشت کا بھی درس دیں۔ حکومت اور سیاستدانوں سے التجا ہے کہ کسی بھی واقعے کے رونما ہو جانے کے بعد پھرتیاں

دکھانے اور بڑے بڑے دعوے کرنے کی بجائے کوئی ایسا ادارہ یا منظم سسٹم بنائیں جو ان واقعات کی بروقت روک تھام کا بندوبست کرے۔ کاش مشال کو بروقت سمجھا دیا جاتا، کاش اس کا توہین آمیز مواد کسی کی نظر میں آتا اور اس سانحے کو برپا نہ ہونے دیا جاتا، کاش ہجوم کو کنٹرول کرلیا جاتا، کاش جذباتی نعرے لگاتے نوجوانوں کو یقین دلا دیا جاتا کہ مشال کے توہین آمیز مواد کی آزادانہ تحقیقات ہوں گی، اگر مجرم ہوا تو سزا بھی ملے گی۔ کاش یہ تاثر مٹایا جاسکے جو بھی توہین رسالت کرے اس کو مغربی ممالک مہمان بنا کر لے جاتے ہیں کاش ارباب حکومت محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبات کو سمجھ سکے اور اس بات کا احساس کرے کہ یہ مسلمانوں کے لئے ان کی جان سے بھی بڑھ کر ہے۔ کاش کوئی ایسا ادارہ بن جائے جو بروقت اقدامات کرکے جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کرسکے۔ کاش مشال اپنے جذبات کو کنٹرول کرتا اور آج زندگی کی بہاریں لوٹ رہا ہوتا۔

بقیہ: جعلی پیر اور جاہل مرید

اس معاشرے کا مستقبل کیا ہوگا جہاں لوگوں کی دین سے محبت کو پیری مریدی کے نام پر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ آئے روز کسی نہ کسی جعلی پیر یا نام نہاد عامل کے ہاتھوں کسی خاتون کی عزت تار تار ہوتی ہے، کسی بچے کو جادو کے لئے قتل کیا جاتا ہے، لوگ اپنے مال و متاع سے محروم ہوتے ہیں، کسی مرید کی جان لے لی جاتی ہے یا شراب، بھنگ، چرس اور منشیات کے باعث قیمتی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں لیکن اس قتل و غارت اور مکروہ دھندے کے بارے میں کہیں بات نہیں ہوتی۔ بس ایک چھوٹی سی خبر بنتی ہے۔ پیر کو ''جعلی'' قرار دے دیا جاتا ہے اور سب پھر سے کسی نئے واقعے کا انتظار شروع کردیتے ہیں۔ یہ کوئی مسلکی اختلاف، اولیائے کرام کی تعلیم و تربیت اور تصوف کا مسئلہ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹتا ہوا ناسور ہے جو ہمارے اپنوں کی جان لے رہا ہے۔ اس بارے میں معاشرے کے ہر فرد کو سوچنا ہوگا اس سے پہلے کہ ہم بھی کسی نام نہاد جعلی پیر یا عامل کے ہاتھوں کسی اپنے کی لاش اٹھائے ماتم کر رہے ہوں۔ کوئی وزیر اطلاعات صاحبہ کو بتائے کہ مشکلات اور بلائیں انڈے وارنے سے نہیں ختم ہوتیں بلکہ اللہ کے آگے جھکنے اور عوام کی خدمت کرنے سے حل ہوتی ہیں۔

توہین رسالت ڈاکٹرمحمد امین

توہین خدا اور سول بچوں کا کھیل بن گئی۔حکمران طبقات کی کوتاہ فکری اور دینی قوتوں کی کوتاہ عملی کا تذکرہ

سانحۂ مردان کی مذمت بجا لیکن....

ایک طرف مغرب زدہ حکمران اور سیکولر طبقے (سیاستدان، عدلیہ، فوج، انتظامیہ اور میڈیا) ہیں اور دوسری طرف دینی قوتیں اور محب دین عوام۔دونوں گروہ اصلاح کے لیے تیار نہیں اور ان کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے جو کسی بھی وقت دھماکہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

کوئی ہے جو سوچے!

مردان کی عبدالولی خاں یونیورسٹی [1] میں جو ہوا وہ افسوسناک اور قابل مذمت ہے جس میں طلبہ کے ایک مشتعل ہجوم نے ایک طالب علم کو گستاخئ رسول و مذہب کے نام پر قتل کر دیا اور دوسرے کو شدید زخمی۔ ملک کے سیکولر طبقے اس پر چراغ پا ہو گئے۔میڈیا نے طوفان اٹھایا، انتظامیہ اور پولیس حرکت میں آگئی، حکمران اور سیاستدان ''مذہب کے نام پر اس دہشت گردی'' کی مذمت میں یکسو ہو گئے (کہ آپس کے ہزار اختلافات کے باوجود مغرب زدگی، ماڈرنزم، سیکولرزم اور لبرلزم کا فروغ اور مذہب بیزاری عمران خان، زرداری اور نواز شریف کے مشترکہ خصائص ہیں) اور چیف جسٹس آف پاکستان نے بھی اس پر سوموٹو ایکشن لے لیا۔ یہ سب مل کر ایک گروہ بن گئے ہیں جس کا موقف ہے کہ یہ جنگل کا قانون ہے، یہ دہشت گردی ہے، اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔گویا توہین خدا اور سول بچوں کا کھیل بن گئی ہے۔اور لطف کی بات یہ کہ یہ سارا پروپیگنڈا اور سرگرمیاں یک طرفہ ہیں۔اہل دین کے نقطۂ نظر کو اور ان کے دلائل کو سامنے لانے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا صرف اس گروہ کا نقطۂ نظر سامنے لاتا ہے گویا دوسرا کوئی نقطۂ نظر سرے سے موجود ہی نہیں؟

دوسری طرف دینی عناصر ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ:

۱۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ، اس کے رسول مکرم ﷺ، اس کی کتاب (قرآن مجید) اور اس کے دین (اسلام) سے محبت ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے اور کوئی مسلمان ان کی توہین، گستاخی اور ان

---

[1] قومی اداروں کے نام ہم عصر متنازعہ سیاستدانوں کے نام پر رکھنا جیسے عبدالولی خاں، بھٹو، بے نظیر، نواز شریف....وغیرہ پتہ نہیں کہاں کی دانش مندی ہے؟ اس سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ناموں کی کوئی کمی تو نہیں۔

سے کھلواڑ برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے جوں ہی کوئی ایسا واقعہ سامنے آئے حکومت کو اس کی نزاکت اور حساسیت کے پیش نظر فوراً اس کے سد باب کے لیے حرکت میں آنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوجائے تو دینی عناصر اور محب دین عوام مطمئن ہوجائیں گے لیکن جب ایسا نہیں ہوتا (اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک توہین رسالت کے کسی مرتکب کو موت کی سزا نہیں دی گئی (حالانکہ اس کا قانون اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور پارلیمنٹ کی طرف سے منظور کردہ ہے اور ملکی قانون کا ایک حصہ ہے جس پر عمل درآمد عدالت، پولیس اور حکومت سب کا فرض ہے) جب حکومت اور اس کے ادارے اپنا فرض پورا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات توہین کے مرتکبین کی حمایت کرنے لگتے ہیں (جیسا کہ سلمان تاثیر نے کیا تھا) تو پھر محب دین عوام میں سے کوئی جذباتی شخص مشتعل ہوکر ایسے ملزم کو کیفرِ کردار کو پہنچا دیتا ہے۔ اب وہ حکومت اور اس کے ادارے جو توہین خدا اور رسول پر خاموش بیٹھے تھے اب اچانک فعال ہوجاتے ہیں۔ اس فعل کو انتہا پسندی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتے جب تک اسے پھانسی پر نہ لٹکا دیں (جیسا کہ غازی ممتاز قادریؒ کے سلسلے میں ہوا)۔

۲۔ سارے علماء اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص توہین رسالت کے مرتکب کو اشتعال میں آکر قتل کردے تو عدالت اس کا جائزہ لے گی کہ اس نے قتل کیوں کیا؟ اور اگر اس نے یہ قتل کسی دوسری غرض سے کیا ہو تو وہ پھانسی کی سزا کا مستحق ہے، اسے سزائے موت دی جانی چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ اس پر سارے علماء متفق ہیں (ملی مجلس شرعی کے علماء اس کے بارے میں باقاعدہ فتویٰ دے چکے ہیں جو چھپ چکا ہے) لیکن علماء کے اس موقف کو کوئی نہیں سنتا۔ اسے میڈیا پر بیان کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا، اسے نمایاں نہیں کیا جاتا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اس کی اشاعت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ علماء کو ان کا موقف بیان کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور حکومت کا اور مغرب زدہ اور سیکولر لوگوں کا موقف ہر سو نمایاں کیا جاتا ہے اور اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ واحد حق ہو اور اس کے خلاف سب کچھ باطل اور بیہودہ ہو۔

۳۔ یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ مغرب بھی اس معاملے میں ایک فعال فریق ہے امریکہ و یورپ علی الاعلان قانون توہین رسالت کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے کالعدم قرار دلوانا چاہتے یا کم از کم غیر موثر بنانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں اور اب بھی کوشاں ہیں اور وہ ان اداروں اور افراد پر وسیع سرمایہ کاری کرتے رہے ہیں جو ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں (جیسا

کہ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق جنگ اور جیو گروپ اور جاوید غامدی صاحب کو ماضی میں سپورٹ کیا گیا)۔اس ضمن میں حکومت اور حکومتی و ریاستی اداروں کا موقف مبنی پر موضوعیت (Objective) اور اسلامی تعلیمات کی حمایت کا نہیں بلکہ مغربی نقطۂ نظر کے کی حمایت کا ہوتا ہے اور جو مغرب کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی دباؤ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

دینی قوتوں اور علماء کرام کی کوتاہیاں

حکومتی حلقوں اور ریاستی اداروں کی مغرب زدگی اور سیکولر رجحانات کی نشاندہی کے بعد ہماری یہ علمی اور اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس ضمن میں دینی قوتوں کی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی ذکر کریں کہ بگاڑ کے موجودہ سطح تک پہنچنے کے وہ بھی ذمہ دار ہیں چنانچہ ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ ملک میں سیکولرزم کے فروغ کی ذمہ داری دینی مدارس کے علماء کرام پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ علومِ حکمت (يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ) سے اعتناء نہیں کریں گے اور خالص دینی علوم بھی صدیوں پہلے کے تناظر میں پڑھائیں گے اور یوں وہ ایسے افراد تیار ہی نہیں کریں گے جو مسلم معاشرے اور ریاست کی رہنمائی کے قابل ہوں (بلکہ وہ صرف مسجد کے امام و خطیب اور مدرسے کے معلم تیار کریں گے)۔ یہ نقطۂ نظر نہ صرف مقاصد قرآن وسنت کے خلاف ہے بلکہ مدارس کی بارہ سوسالہ علمی روایت کے بھی خلاف ہے....لیکن مدارس آج بھی اس پر مصر ہیں۔

۲۔ دینی قوتوں نے جدید تعلیم سے صَرفِ نظر کیا اور اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی بلکہ ان کا یہ شرمناک کردار سامنے آیا ہے کہ دینی جماعتوں کے لوگ بھی محض تجارت اور نفع اندازوی کی خاطر جدید تعلیمی ادارے قائم کر کے مغربی فکر و تہذیب کو فروغ دے رہے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید تعلیم سے فارغ ہو کر جن لوگوں نے معاشرے اور ریاست کو چلایا وہ دینی تعلیم و تربیت سے محروم رہے اور مغرب زدہ تعلیم نے انہیں سیکولر اور لبرل بنا دیا۔

۳۔ دینی قوتوں نے پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کو کماحقہ اہمیت نہیں دی۔ یہ اتنا موثر ذریعہ ہے کہ اس کے غلط استعمال نے مسلم معاشرے میں صدیوں سے جاری اسلامی اصول واقدار کو ہمارے دیکھتے چند سالوں میں ملیامیٹ کر دیا ہے۔ذہن سازی اور شخصیت سازی میں میڈیا کے کردار کی اہمیت سے غفلت آج بھی دینی حلقوں کا شعار ہے اور وہ اس کی اہمیت سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

۴۔ دینی لوگوں نے سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مسلک پر قائم کیں اور آپس میں لڑتے رہے۔اس سے دین کی ہوا خیزی بھی ہوئی اور خود انہیں بھی شکست سے دو چار ہونا پڑا۔لیکن وہ اس سے سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔حد یہ ہے کہ یہ جماعتیں دنیاوی مفاد کے لیے سیکولر جماعتوں سے اتحاد کر لیتی ہیں لیکن آپس میں متحد نہیں ہوتیں۔

ان جماعتوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ غیر سیاسی دینی اداروں اور جماعتوں کو اپنے حق میں متحرک نہیں کر سکیں۔اور وہ خود بھی سیاسی جدوجہد تک محدود رہتی ہیں اور گراس روٹ لیول پر عوام کی اصلاح اور دینی تربیت کا کام نہیں کرتیں۔

۵۔ ہماری دینی قوتوں نے عوام میں دین سے جذباتی تعلق تو پیدا کیا اور اسے مستحکم بھی کیا لیکن اسے شعوری تعلق میں نہیں بدلا کہ وہ ان کی زندگی کو بدلتا اور انہیں عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بناتا۔

۶۔ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے زیر اثر جو اس وقت دنیا پر غالب ہے اور ملک میں مغرب زدہ تعلیم و تربیت اور میڈیا کی وجہ سے ہمارے ملک میں لاکھوں نہیں کروڑوں ایسے افراد موجود ہیں جو دینی تعلیم و تربیت سے محروم رہے ہیں۔ان کو شعوری طور پر مسلمان بنانے کی،ان سے ڈائیلاگ کرنے کی،ان کے شکوک وشبہات دور کرنے اور دلائل سے انہیں اسلام کے حق میں قائل کرنے کی صلاحیت ہمارے علماء کرام میں ہے ہی نہیں کیونکہ وہ مغربی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مائنڈ سیٹ سے واقف ہی نہیں۔اس چیز نے نہ صرف علماء اور عام پڑھے لکھے لوگوں میں بُعد اور دوری کی فضا پیدا کر دی ہے بلکہ ان کے سوچنے اور ابلاغ کی فریکونسی بھی ایک نہیں رہنے دی جس سے علماء کرام جدید ذہن کے اشکالات کے حامل افراد کو نہ تو مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ ان کے دل ودماغ کو جیت سکتے ہیں۔

ہم علماء اور دینی قوتوں کے فہیم عناصر کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ وہ ہماری باتوں پر غور فرمائیں۔ہم ان کے حلیف ہیں،حریف اور نقاد نہیں۔ہم ان کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں،ناکام نہیں۔لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ علماء کرام اور دینی عناصر اپنی سرگرمیوں کے منہج پر نظر ثانی کریں۔وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیں،عصری تقاضوں کو سمجھیں اور دین کو زندہ اور موثر قوت بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

اسلام اور پاکستان　　پروفیسر ملک محمد حسین

ہمارا دیمک زدہ معاشرہ اخلاقی تنزل کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے

جائیں تو جائیں کہاں؟

[ہمارا معاشرہ جس اخلاقی بحران میں مبتلا ہے برادرم پروفیسر ملک صاحب نے اپنے مشاہدے کی بناء پر اس مضمون میں اس کی خوب عکاسی کی ہے۔ کیا اس کا کوئی حل بھی ہے؟ دیکھیے مضمون کے آخر میں ہمارا اضافہ۔ مدیر]

موضع چن کے ہیڈ ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ پوچھا کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہنے لگے ڈسٹرکٹ اکاؤنٹ آفس گیا تھا، سالانہ انکریمنٹ لگوانا تھی۔ میں نے کہا تنخواہ میں سالانہ انکریمنٹ لگنا تو ایک روٹین کی بات ہے آپ اس کام کے لیے ڈسٹرکٹ اکاؤنٹ آفس کیوں گئے؟ کہنے لگے روٹین کی بات ہوتی تھی، اب تو ہر سال ہزار دو ہزار روپے دیں تو یہ روٹین عمل پذیر ہوتی ہے۔ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ وٹرنری اسسٹنٹ محمد رمضان نے محکمہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس نے بتایا کہ پنشن منظور کرانے کے لئے دفتر کے کلرک کے ذریعے اکاؤنٹ آفس والوں کو آٹھ ہزار روپے دیے ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے ایک ماہ کے اندر ہی سب کچھ منظور ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اس میں اللہ کی مہربانی کہاں۔ آپ نے تو اللہ کی ناراضی مول لی ہے۔ رشوت جو دی ہے۔ کہنے لگا اگر جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ اُدھر اسماء بی بی کا فون آیا کہ ای ڈی او ایجوکیشن اور اکاؤنٹ آفس والے تنخواہ جاری کرنے کے پیسے مانگتے ہیں۔ آٹھ ماہ تک صبر کیا ہے۔ کہتے ہیں ہم ہر ایجوکیٹر سے ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر پیسے لیتے ہیں کیونکہ یہ رقم درجہ بدرجہ صوبے کے حاکم اعلیٰ تک جاتی ہے۔ سر میں کیا کروں اب تو نوبت فاقوں تک پہنچ چکی ہے۔ آپ نے ہی رشوت لینے دینے سے منع کیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہیں ہو رہا۔

کل اشرف صاحب ملنے آئے۔ ان کی زوجہ محترمہ سولھویں گریڈ میں نرس ہیں۔ بتا رہے تھے کہ ضلعی محکمہ صحت میں سالانہ رپورٹ لکھوانے کے پانچ ہزار، پسند کے ہسپتال میں تبادلہ کرانے کے تیس سے پچاس ہزار اور اسی طرح دیگر چھوٹے موٹے ملازمت کے معاملات کے حل کے لیے

500 سے 5000 ہزار روپے دینے پڑتے ہیں۔

سپاہی غلام محمد اکثر گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتا نظر آتا ہے۔ میں نے پوچھا عزیزم آپ تو لاہور پولیس میں ملازم ہیں۔ یہاں آئے روز آپ کیسے نظر آتے ہیں؟ جو بات غلام محمد نے بتائی وہ تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی۔ کہنے لگا کہ بڑے شہروں کی پولیس کی نفری کا تقریباً دس فیصد ہمیشہ فرلو پر رہتا ہے۔ ایک ماہ فرلو پر رہنے کے لیے اس ایک ماہ کا کھانے کا خرچ حاضری لگانے والے اہل کار کو دینا پڑتا ہے۔ یہ کر کے آپ آرام سے گاؤں آجائیں اور گھر کے کام کریں۔ ایک ضلع ہیڈ کوارٹر میں ایک صاحب پراپرٹی کا کاروبار کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈسٹرکٹ فیملی پلاننگ آفیسر کے ڈرائیور ہیں لیکن آدھی تنخواہ دے کر وہ آفیسر اُسے ڈیوٹی سے فارغ رکھتا ہے اور سرکاری جیپ خود چلاتا ہے یا کسی چھوٹے ملازم سے چلواتا ہے۔

ہمارے ایک جاننے والے بزرگ بتارہے تھے کہ میں نے ریڑھی سے اپنے ہاتھ سے چن کر آم خریدے لیکن جب گھر جا کر شاپر کھولا تو اکثر آم گلے سڑے تھے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ جستجو کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ریڑھی والوں نے کلو، دو کلو گے سڑے آم شاپروں میں ڈال کر ریڑھی کی دوسری طرف لٹکا رکھے ہوتے ہیں۔ گاہک جب اپنی مرضی کا فروٹ تلوا کر پیسے دیتے ہوئے ذرا بے دھیان ہوتا ہے تو وہ دھوکے باز ریڑھی والا شاپر بدل دیتا ہے اور گاہک خوشی خوشی شاپر لے کر جب گھر پہنچتا ہے تو اُسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اُس نے تو خود اچھے اچھے آم چنے تھے یہ گلے سڑے آم کہاں سے آگئے۔ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں ایک دفعہ ایک مکان پر چھاپا پڑا، جہاں لپٹن چائے کے ڈبوں میں جعلی چائے پیک کی جارہی تھی۔ بیچارے کارکن دھر لیے گئے کیونکہ اس کاربار کا مالک عمرے پر سعودی عرب گیا ہوا تھا۔ ایک اقامتی سکول میں جہاں کم عمر طلبہ زیر تعلیم تھے، لواطت کی شکایات سامنے آئیں۔ تحقیق ہوئی تو شکایات درست نکلیں۔ سرزنش پر سکول کے منتظمین نے موقف اختیار کیا کہ یہ کوئی ایسی خلاف معمول خرابی نہیں ہے کیونکہ یہ کام تو اقامتی دینی مدارس میں منبر و محراب کے سائے میں اکثر جگہوں پر ہوتا ہے۔

سید صاحب کو پراسٹیٹ کی تکلیف تھی۔ پیشاب کے ساتھ پس (Pus) بھی آرہی تھی۔ چغتائی لاہور لیب سے متعلقہ ٹیسٹ کروا کر ایک نجی ہسپتال کے یورالوجی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اُس نے پھر یورین کمپلیٹ ایگزامی نیشن اور الٹرا ساؤنڈ کے ٹیسٹ اُسی ہسپتال کی لیب سے کروانے کو کہا۔ میں نے اعتراض کیا تو سید صاحب نے جو خود بھی طبیب ہیں کہا کہ چھوڑیں ان کی

مجبوری ہے۔ اگر یہ ہسپتال کو اپنی فیس کے علاوہ بزنس نہیں دیں گے تو ہسپتال کے مالک بُرا منائیں گے۔ چھوٹی پوتی کو معدے میں خرابی کے ساتھ بخار بھی تھا۔ نجی ہسپتال کے چائلڈ سپیشلسٹ کے پاس گئے اُس نے 700 روپے کے ٹیسٹ کروا ڈالے۔ مزید ایک ہزار کی دوائیاں تجویز کر دیں۔ اس کی اپنی فیس علاوہ تھی۔ افاقہ کی بجائے تکلیف بڑھی تو ایک دیسی حکیم جنہیں جدید ڈاکٹر عطائی کہتے ہیں، کے پاس حاضر ہوئے۔ ایک سو روپے کی 10 پڑیاں جو تین دن میں لینا تھیں بچی کو دینا شروع کیں تو پہلے ہی دن تقریباً مکمل افاقہ ہو گیا۔

ہماری ایک شاگردہ کے گھر آگ لگی۔ سامان کے ساتھ میٹرک کی سند بھی جل گئی۔ بورڈ کو ڈپلیکیٹ سند جاری کرنے کی درخواست دی تو دو ماہ کے بعد خط آ گیا کہ آپ کی تاریخ پیدائش مشکوک ہے۔ سکول کا اصلی داخل خارج رجسٹر اور یونین کونسل سے پیدائش کے اندراج کا اصل ریکارڈ لے کر بورڈ میں حاضر ہوں۔ خوش قسمتی سے بورڈ کا سیکرٹری میرا شاگرد رہا تھا۔ اعتراض نامہ لے کر موصوف کے پاس گیا کہ مشکوک تاریخ پیدائش پر پہلی سند کیسے جاری ہوئی جو اب ڈپلیکیٹ سند جاری کرنے پر یہ اعتراض لگایا گیا اور کیا آپ نے ہی اس اعتراضی خط پر دستخط کیے ہیں۔ شرمندہ ہو کر کہنے لگا کہ کلرک دھوکے سے دستخط کرا لیتے ہیں اور لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ بہر حال کلرک کو بلا کر جھڑکا اور کہا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈپلیکیٹ سند کمپیوٹر سے نکال لاؤ۔ اور ڈرتے ڈرتے یہ بھی بتا دوں کہ (دروغ برگردن راوی) لانس نائیک محمد ریاض جو ایک سی ایم ایچ میں جنرل ڈیوٹی پر فائز تھا ایک دفعہ فلو کا شکار ہو گیا۔ کوئی مشکل تو تھی ہی نہیں۔ ڈاکٹر سے تجویز کرا کر فارمیسی سے پاناڈول کی ٹیبلٹس کا پورا پیکٹ لے لیا اور تجویز کردہ خوراک کے برابر کھا بھی لیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ مجبوراً پرائیویٹ میڈیکل سٹور سے جا کر وہی دوائی لی اور ایک دو خوراکیں کھانے کے بعد بھلا چنگا ہو گیا۔ اُس نے میڈیکل سٹور والوں سے وجہ پوچھی کہ سی ایم ایچ سے لی گئی دوائی نے اثر نہیں کیا لیکن آپ کی دو ہی گولیوں نے کام کر دکھایا۔ میڈیکل سٹور والے نے مبینہ طور پر جو بات کہی وہ بڑی حیران کن تھی۔ اُس نے کہا کہ آپ نے سی ایم ایچ سے سپاہیوں کے لیے دی جانی والی دوائی لی جب کہ میں نے آپ کو افسروں کو دی جانی والی ٹیبلٹس دیں۔ ظاہر ہے فرق تو پڑنا تھا۔

ہم نے معاشرے کے اندرونی منظر نامے کے چند واقعات کا ذکر کیا ہے جو کرپشن، بدعنوانی، بدمعاشی اور بلیک میلنگ کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے حکمران سب اچھا کا

نعرہ لگاتے ہیں اور دینی سیاسی قائدین اپنے سیاسی حریفوں کی کرپشن کے خلاف عدالتوں ااور سڑکوں پر نعرے لگاتے ہیں۔

معاشرہ اندر سے گل سڑ کر تباہ ہو رہا ہے بلکہ تباہ چکا ہے لیکن یہ اوپر سے لیپا پوتی میں مصروف ہیں۔عوام جن کی تکالیف کم کرنے کے آپ داعی ہیں وہ تو مذکورہ مصائب کی وجہ سے ذہنی مریض بنتے جا رہے ہیں اور آپ اپنے حریفوں کی کرپشن کے خلاف ریلیاں اور جلسے کر رہے ہیں۔کیا معاشرے میں وسیع پیمانے پر اور گراس روٹ لیول پر پھیلتی اس بدعنوانی کا بھی کوئی سدِ باب کرے گا؟

اضافہ از مدیر

برادرم پروفیسر ملک صاحب نے ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے دیمک زدہ جس معاشرے کی عکاسی کی ہے اس کا علاج کیا ہے؟

قرآن وسنت اور سیرت سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے گراس روٹ لیول پر ایمان کی آبیاری کے لیے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کا کام.... لیکن افسوس اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو صرف انتخاب لڑنے سے دلچسپی ہے۔ بظاہر تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، دینی مدارس اور حلقۂ تصوف کے لوگ یہی کام کر رہے ہیں لیکن ان کے ہاں بھی یہ کام متوازن انداز میں اور صحیح خطوط پر نہیں ہو رہا۔ وہاں بھی مسلک پرستی ہے، دین کا ناقص تصور ہے اور کئی جگہوں پر دنیا داری، دین داری پر غالب ہے۔ ڈھانچہ موجود ہے لیکن روح سے خالی ہے۔

دوسری طرف فساد کی قوتیں منظم اور طاقتور ہیں اور انہیں ریاستی ڈھانچے اور مغرب کی لا دین فکر وتہذیب کی علمبردار عالمی قوتوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے جو مسلمان معاشرے میں فکری اور اخلاقی انارکی پھیلا کر اسے کمزور کرنے بلکہ تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔اے اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما اور ہمیں اصلاح کی توفیق دے۔آمین یا ربّ العالمین.

اسلام اور پاکستان پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں انتخابی معرکہ

دینی سیاسی جماعتوں کے لیے ایک تجزیہ

غالباً ایک سال کے اندر اندر قومی انتخابات کا معرکہ برپا ہونے والا ہے بعض سیاسی جماعتیں منصوبہ بندی میں مصروف ہیں جب کہ بعض دیگر جماعتوں نے ہلکی پھلکی انتخابی مہم بھی شروع کر دی ہے۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی جواب دینی کم اور سیاسی زیادہ ہوگئی ہیں، معرکہ میں اُترنے کے لیے بے تاب ہیں۔ رضا خیل میں جمعیت علمائے اسلام کا جمعیت علمائے ہند کے تسلسل میں صد سالہ کنونشن مولانا فضل الرحمن کی سیاسی ذہانت کا شاہکار اقدام ہے پاکستان میں مولانا اب اسلامی سیاسی تحریک کے قائد بنتے نظر آرہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی نے بھی اپنے اندرونی حلقوں میں الیکشن کی تیاری کا سگنل دے دیا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ جماعت اسلامی آئندہ الیکشن میں قومی اسمبلی کی 82 سیٹوں پر الیکشن لڑے گی اور اسی تناسب سے صوبائی اسمبلیوں کے لئے بھی افراد کھڑے کیے جائیں گے۔ دیگر مسلکی سیاسی جماعتیں بھی یقینا سوچ بچار کر رہی ہوں گی۔ محترم ڈاکٹر طاہر القادری کی عوامی تحریک بھی یقینا اندرونی حلقوں میں متحرک ہوگی لیکن اپنے قائد محترم کے عمومی طور پر کینیڈا اور دیگر غیر ممالک میں قیام کی وجہ سے شاید ابھی اُن کی سرگرمیاں زیادہ ظاہر نہیں ہورہیں۔

وطنِ عزیز میں دینی سیاسی جماعتوں کی الیکشن پرفارمنس کبھی زیادہ قابل توجہ نہیں رہی سوائے ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں جب ایم ایم اے نے قابل لحاظ نشستیں جیتیں، صوبہ خیبر پی کے میں حکومت بھی بنائی لیکن دیرپا گڈ گورننس کا کوئی خاطر خواہ نمونہ پیش نہیں کر پائے۔ جمعیت علمائے اسلام اپنے وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مدارس، تبلیغی جماعت کی خاموش پشت پناہی اور علمائے کرام کے وسیع نیٹ ورک کی وجہ سے اتنی سیٹیں حاصل کر لیتی ہے کہ حکومت بنانے والی اکثریتی پارٹی کو اُن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور مولانا فضل الرحمن بھی اپنی سیاسی ذہانت اور بصیرت کی

وجہ سے اپنی پارٹی کی جسامت سے زیادہ حصہ وصول کر لیتے ہیں۔ مولانا اب آہستہ آہستہ اپنا بین الاقوامی امیج بھی پسندیدہ اور مئوثر بنانے میں کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اُن کے حالیہ پانچ نکات بین الاقوامی سیاست کے اچھے فہم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی ابھی تک ردِعمل کی سیاست سے باہر نہیں آپارہی۔ کارکنوں کی تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن منفی تنقیدی رجحان اور ردِعمل کے رویے ہی غالب نظر آتے ہیں۔ الیکشن کے لئے ٹھنڈے دل سے صورتِ احوال کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے اور گراس روٹ لیول پر افراد اور گروہوں کی سوچ کے دھاروں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اسلامی انقلاب کی اصطلاح اب جہاں معنوی طور پر دھندلا چکی ہے وہاں اس کی دلکشی بھی قائم نہیں رہی۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے بھی جو بعد میں شیعہ انقلاب میں ڈھل گیا، اثر دکھایا ہے۔ طالبان، القاعدہ اور داعش کے ظہور نے بھی اسلامی انقلاب کو دھندلانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے لہذ انتخابی سیاست میں اب ایک نئی سوچ اور نئی حکمت عملی پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاسی اتحاد، سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے طریقے اور اسی طرح کے پرانے ہتھکنڈے کم از کم دینی سیاسی جماعتوں کے لیے بے کار ہیں۔ ہاں! ان طریقوں سے چند ایک ایسے لیڈران مستفید ہو سکتے ہیں جو دینی سیاسی جماعتوں کے چوٹی کے عہدوں پر فائز ہیں۔ ظاہر ہے اس سے کوئی تبدیلی تو نہیں آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو دینی سیاسی حلقوں کے قائدین کی سوچ میں آئے گی جو اپنے آپ کو قابلِ قبول بنانے کے لیے وہ اختیار کریں گے۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد ہم پاکستان میں الیکشن کی سماجی اور نفسیاتی کیفیت کا ذکر کریں گے جو ہماری ذاتی رائے اور تجربے کا حاصل ہے سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی امیدوار کو ووٹ کس بنیاد پر ملتے ہیں۔

1۔ پارٹی کی بنیاد پر

۱۔ جس پارٹی کا حجم بڑا ہو۔ ۲۔ جس پارٹی کا پروپیگنڈہ زیادہ ہو۔

۳۔جس پارٹی کا عوام میں امیج اچھا ہو۔ ۴۔جس پارٹی کے پاس مضبوط امیدوار ہوں۔
۵۔جس پارٹی کی عوام میں جڑیں ہوں۔ ۶۔جس پارٹی کے پاس مخلص ورکرز ہوں۔
۷۔جس پارٹی کے پاس مفاد یافتہ ورکرز کی بڑی تعداد ہو۔
۸۔جس پارٹی سے لوگوں کا مفاد وابستہ ہو۔
۹۔جس پارٹی کے الیکشن میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں۔

2۔برادری اور برادری کے چوہدریوں کی بنیاد پر

۱۔لوکل سطح کی برادریاں ۲۔پھیلی ہوئی برادریاں

3۔بااثر افراد کی بنیاد پر اگر وہ ساتھ دے رہے ہوں

۱۔مقامی بااثر افراد ۲۔گلی محلے کے بااثر افراد ۳۔ذرا وسیع سطح کے بااثر افراد جو تھانے کچہری اور دیگر دفاتر میں کام آتے ہیں یا کام آ سکتے ہیں۔ ۴۔مقتدر سرکاری ملازم جس امیدوار کی پشت پناہی کر رہے ہوں۔ ۵۔خوشی غمی میں تسلسل کے ساتھ شرکت کی ہو۔

4۔کام اور کارکردگی کی بنیاد پر

۱۔گلی محلے میں ڈویلپمنٹ کے کام کیے ہوں ۲۔ علاقے کی بنیاد پر ڈویلپمنٹ کے کام کیے ہوں۔ ۳۔لوگوں کو نوکریاں دلانے میں مدد کی ہو
۴۔ملازمین کے ملازمانہ مسائل (انفرادی) میں مدد کی ہو۔

5۔اثر پذیری کی بنیاد پر

۱۔پٹواری، تحصیل دار اور ضلعی افسروں پر اثر ورسوخ ہو۔ ۲۔تھانیدار، پولیس میں اثر ورسوخ ہو۔ ۳۔علاقائی اور صوبائی دفاتر میں اثر ورسوخ ہو۔ ۴۔امیدوار جو جرات مند ہو اور غریبوں/مظلوموں کے حقوق کے لیے ڈٹ جاتا ہو اور امیدوار کی یہ عادت معروف ہو۔

6۔منبر ومحراب اور دینی مدارس

مساجد کے امام اور خطیب بھی ووٹ کے سلسلہ میں اثر انداز ہو سکتے ہیں۔دینی مدارس کے

اساتذہ، طلبہ اور طلبہ کے والدین بھی ووٹ لینے دینے میں اثر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیروں کی گدیاں اور اُن کے بااثر مریدوں کی الیکشن میں اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ووٹ کس بنیاد پر نہیں ملتے ہیں

۱۔ محض نیکی اور دیانتداری ۲۔ ریلیاں اور جلسے ۳۔ عام ورکرز کی ڈور ٹو ڈور کمپین

۴۔ اخباری بیانات ۵۔ عوامی خدمت کے کاموں سے مثلاً الخدمت فاؤنڈیشن وغیرہ

۶۔ درسِ قرآن اور دیگر نظریاتی حلقے ۷۔ اخباری اشتہارات

۸۔ ہینڈ بلز، وال چاکنگ، فلیکس ہورڈنگز وغیرہ

کیا ہونا ضروری ہے؟

1۔ امیدوار کا وسیع تعارف جو پہلے سے موجود ہو۔ 2۔ امیدوار کا اپنا ہارڈ نیوکلیس جو مخلص دوستوں پر مبنی ہو۔ 3۔ الیکشن کے دوران کام کرنے والا مؤثر تنظیمی ڈھانچہ 4۔ ہر وارڈ میں کم از کم ایک مؤثر کارکن جو اپنے طور پر متحرک ہو۔ 5۔ الیکشن کمپین کی ڈاؤن ٹو دی ارتھ تحریری شکل میں مؤثر منصوبہ بندی۔ 6۔ انتخابی منصوبہ بندی کے نفاذ کی مانیٹرنگ کے لیے دو تین سینئر حضرات کی مانیٹرنگ ٹیم 7۔ پولنگ اسٹیشن پر مؤثر پولنگ ایجنٹس کی موجودگی

جماعتِ اسلامی اور دیگر دینی سیاسی جماعتوں کے امیدوار کا خصوصی ٹارگٹ

1۔ مسجد اور امام مسجد 2۔ بزرگ افراد جو باقاعدہ نماز پڑھتے ہوں

3۔ مستضعفین، غریب اور بے نوا لوگ 4۔ نوجوان خصوصاً بے روزگار جوان

ہم سمجھتے ہیں کہ کہ معاشرے کے تار و پود کو جانے بغیر کوئی ایسی دینی سیاسی جماعت جس کے پاس نہ جاگیردار ہوں نہ مشائخ عظام اور جس کے پاس نہ تو دینی مدارس کا نیٹ ورک ہو اور نہ ہی علمائے کرام کا سلسلہ، کوئی انتخابی معرکہ سر نہیں کر سکتی۔ اُسے سائنسی بنیادوں پر تجزیاتی حکمت عملی اپنانا ہوگی جس سے وہ معاشرے کے مختلف اجزاء کا فہم حاصل کرے، ان کی ضرورتوں، اُن کی دکھتی ہوئی رگوں کا شعور اور اُن کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کم کرنے کے طریقے دریافت کرے اور اُن کے ذہنی سطح پر اُتر کر اُن سے محبت بھرا رابطہ کرے۔ یہ محنت طلب اور وقت طلب کام ہے،

اُس طریقے کے مقابلے میں جس میں فلیکس ہورڈنگ لگائے، ریلیاں نکالی اور کارنر میٹنگ کی جاتی ہیں آسان ہے، لیکن نتیجہ خیز نہیں ہے۔ بقول ایک دینی دانشور کے کہ معاشرے میں اس طرح پھیل جائیں جس طرح پانی ہموار میدان میں گھاس کے نیچے نیچے ہر طرف پھیل جاتا ہے لیکن نظر نہیں آتا اور پنا کام کر جاتا ہے۔

معاشرے میں انتخابی نفوذ کے لیے معاشرتی آبادی کے خدوخال جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر آپ میکرو لیول پر آبادی کو متاثر کرنا چاہتے ہیں تو آبادی کی نوعیت جاننا ضروری ہے۔ ہمارے مطالعہ کے مطابق پاکستان میں آبادی کے خدوخال کچھ اس طرح ہیں۔

الف۔ دیہاتی آبادی 50 فیصد دیہاتی آبادی کی تقسیم

1۔ بے زمین کسان 15 فیصد 2۔ چھوٹے زمیندار 45 فیصد 3۔ بڑے زمیندار 15 فیصد 4۔ جاگیردار 2.0 فیصد

5۔ دستکار 5 فیصد 6۔ مزدور 5 فیصد 7۔ ملازمت پیشہ 10 فیصد

ب۔ قصباتی آبادی 30 فیصد

1۔ چھوٹے زمیندار 20 فیصد 2۔ بڑے زمیندار 10 فیصد 3۔ جاگیردار 1.0 فیصد

4۔ ملازمت پیشہ لوگ 15 فیصد 5۔ ریڑھی والے خوانچہ فروش 5 فیصد

6۔ چھوٹے دکاندار 15 فیصد 7۔ بڑے کاروباری 5 فیصد 8۔ مزدور 10 فیصد

9۔ دستکار 10 فیصد 10۔ اہل علم ودانش 5.0 فیصد

ج۔ بڑے شہروں کی آبادی 20 فیصد جن میں دیہاتوں اور قصبوں سے اُٹھ کر آنے والے لوگ، چھوٹے ملازمین، بڑے ملازمین، چھوٹے کاروباری، بڑے کاروباری، ریڑھی والے، خوانچہ فروش، دستکار، ریٹائرڈ بزرگ، مزدور وغیرہ شامل ہیں۔

رہائشی علاقوں سے قطع نظر آبادی کی تقسیم

1۔ زراعت سے متعلق آبادی 2۔ کاروبار سے متعلق آبادی 3۔

ملازمت سے متعلق آبادی 4۔ چھوٹے طبقات ازقسم ریڑھی والے، خوانچہ فروش، رکشہ/گاڑی ڈرائیور 5۔ورکشاپوں کے ملازم،عمارتی مزدور 6۔ چھوٹے ملازم یعنی درجہ چہارم کے ملازم 7۔متوسط درجہ کے ملازمین یعنی کلریکل سٹاف وغیرہ 8۔ مذہبی طبقات سے تعلق والی آبادی۔ 9۔کالجوں یونیورسٹیوں کے طلبہ 10۔بےروزگار نوجوان

11۔گھریلوخواتین

ہمارے ملک میں قابل توجہ آبادی کے طبقات حسب ذیل ہیں:

1۔گھریلوخواتین 2۔بیروزگار نوجوان 3۔18سال سے زائدعمر کے طلبہ

4۔عمارتی اور ورکشاپس کے مزدور 5۔چھوٹے ملازمین 6۔اساتذہ

7۔بزرگ نمازی 8۔محلوں کی مساجد کے امام/خطیب

اگر کوئی دینی سیاسی جماعت خاموشی کے ساتھ آبادی کے ان طبقات سے مئوثر رابطے کے نتیجے میں ان کی حمایت حاصل کر سکتی ہے تو معجزے کی توقع کرنا ممکن ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کے لیے ایک اور قابل غور تجویز یہ ہے کہ وہ اپنے پلیٹ فارم سے بھی زیادہ سے زیادہ جید علمائے کرام کو ٹکٹ دیں اور دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی دعوت دیں کہ اگر وہ کسی مستند عالم دین کو ٹکٹ دیتے ہیں تو دینی سیاسی جماعتیں اُن کے خلاف اپنا امیدوار کھڑا نہیں کریں گی۔ نیز وہ اپنے طور پر بھی فیصلہ کریں کہ وہ ایک دوسرے جید علمائے کرام کے خلاف مقابلہ بازی کا ماحول نہیں بنائیں گے۔ اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ سے زیادہ علمائے کرام قانون ساز ادارون میں پہنچیں اور اس طرح سیکولرزم اور لبرلزم کا راستہ روکا جاسکے۔

اسلام اور پاکستان پروفیسر عاصم حفیظ

جعلی پیر اور جاہل مرید

سرگودھا میں ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے الیکشن کمیشن میں اٹھارویں گریڈ کے آفیسر پیر کے ہاتھوں بیس مریدوں کے قتل نے پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔میڈیا پورا زور لگا رہا ہے کہ ثابت کرے کہ پیر صاحب جاہل، گنوار اور جعلی تھے۔لیکن اس حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں کہ اٹھارویں گریڈ تک کوئی پڑھا لکھا ہی پہنچتا ہے۔اور اس کے اصلی ہونے کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ اس بھیانک واردات کے بعد بھی اس کے عقیدت مندوں کو اتنا حوصلہ نہیں ہو رہا کہ کوئی مقدمے کا مدعی ہی بن جائے۔ ہر کوئی پیر صاحب کے جلال سے خوفزدہ ہے۔ادھر پیر صاحب بھی بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ انہیں ذرا موقعہ دیا جائے تو وہ ان بیس افراد کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں۔ ہاں البتہ خود کو پولیس سے رہائی نہیں دلوا سکتے۔صدقے جائیں اس پیر کے عقائد پر کہ جو قدرت سے لڑ کر مُردوں کو زندہ کرنے کا تو دعوے دار ہے لیکن چند پولیس والوں کو قابو کرنے سے قاصر ہے۔لیکن پھر بھی اس کی باتیں سنی جارہی ہیں۔یہ تو پکڑا گیا، ایسی ہی بہت سی اونچی اونچی ہستیاں اور پہنچی ہوئی سرکاریں آپ کو جگہ جگہ مل جائیں گی جن کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد بھی موجود ہے۔کوئی مگرمچھوں کی پوجا کرا رہا ہے، کوئی گندے تالابوں میں ڈبکیاں لگوا رہا ہے، کوئی برہنہ کر کے زدوکوب کر رہا ہے، درخت سے الٹے لٹکا کر علاج کر رہا ہے۔زنا، شراب نوشی، بھنگ، چرس اور جرائم کی داستانیں ہیں کہ جو پیری مریدی کی آڑ میں برپا کی جارہی ہیں۔

المیہ تو یہ بھی ہے کہ کوئی پیر صاحب جو مرضی کرتے رہیں، ہزاروں مرید بھی بنالیں، ہر قسم کی حرکتیں بھی دھڑلے سے کریں لیکن انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔جیسے ہی وہ کوئی بڑی واردات ڈالتے ہیں اور معاملہ میڈیا تک پہنچتا ہے تو وہ ''جعلی اور نام نہاد'' قرار پاتے ہیں۔معاملے کا رخ ہی بدل دیا جاتا ہے گویا ایک شخص کو موردالزام ٹھہرا کر باقی سب کو بچالیا جاتا ہے جو اس سارے گھناؤنے دھندے میں ملوث ہیں۔ملک بھر کے ہر طبقہ فکر اور مسالک کے علمائے کرام اس طرح کی پیری مریدی اور مزارات پر ہونے والے غیر شرعی امور کی واضح مخالفت کر چکے ہیں۔یہ مسئلہ کوئی مسلکی اختلاف کا نہیں بلکہ اس دھندے کی آڑ میں اسلام کو بدنام کرنے کے ساتھ ساتھ بعض گمراہ اور

بدفطرت افراد اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتے ہیں۔حکومت، علمائے کرام، سکالرز اور معاشرے کے ہر طبقے کو چاہیے کہ اس حوالے سے اپنا کردار ادا کرے تا کہ سادہ لوح عوام کی زندگیاں بچائی جاسکیں، عورتوں کی عزتوں کا تحفظ ہو سکے اور نذرانوں کے بل پر عیاشی کرتے ان گدی نشینوں اور نام نہاد پیروں کی روک تھام ہو سکے۔ یہ اولیائے کرام کے وارث نہیں بلکہ ان کے نام کو استعمال کر کے عوام کو لوٹنے والے ڈاکو ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

المیہ تو یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں توہم پرستی، بدعقیدگی اور جاہلانہ رسومات صرف سادہ لوح دیہاتی اور ان پڑھ لوگوں تک محدود نہیں بلکہ ہماری سیاست وحکومت میں بھی جھوٹی پیری مریدی کا راج ہے۔وزیر اعظم نواز شریف اپنی قسمت جگانے کے لئے ایک بابا جی کی چھڑیاں کھا چکے ہیں جبکہ انہی بابا جی نے محترمہ بےنظیر بھٹو کو بھی چھڑی مار کر خوشخبری سنائی تھی۔تازہ ترین ویڈیو ہماری سرگرم وزیر اطلاعات محترمہ مریم اورنگزیب صاحبہ کی سامنے آئی ہے جس میں وہ ہاتھوں میں چھ عدد انڈے پکڑ کر بیٹھی ہیں۔ان کے ساتھ بیٹھی ایک بزرگ خاتون ایک ایک کر کے انڈہ مریم اورنگزیب کے سر سے وارتی ہیں اور بعدازاں یہ سارے انڈے صدقہ کرنے کے لئے کسی کو پکڑا دیئے جاتے ہیں۔ جی ہاں یہ المیہ ہے ہمارے معاشرے کا کہ جہاں ملک کی وزیر اطلاعات اپنی بلاؤں کو ٹالنے کے لئے انڈوں کی مشکل کشائی کا سہارا لیتی ہیں۔انہیں یقین ہے کہ ان کی مشکلات چھ انڈے صدقہ کرنے سے حل ہو جائیں گی اور وہ اس سارے عمل کی باقاعدہ ویڈیو بھی بنوا رہی ہیں۔ایسے معاشرے میں اگر کوئی جعلی پیر بیس مریدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے تو ہمیں کچھ زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے۔

جس معاشرے میں ملک کی حکمران پارٹی کے سربراہ جناب مخدوم امین فہیم صاحب خاندانی جائیداد بچانے کے لئے اپنی بہنوں کا نکاح قرآن پاک سے کر دیں۔ جہاں تبدیلی اور ملک کی تقدیر بدلنے کی دعوے دار پارٹیوں کے اہم عہدوں پر لوگوں کے نذرانوں پر پلنے والے گدی نشین قابض ہوں وہاں بیس افراد کے گلے کاٹنے جیسی حرکت کوئی بڑی بات نہیں لگتی۔جس ملک میں کبھی اس بارے میں پوچھا ہی نہ گیا ہو کہ بڑے بڑے جاگیرداروں کے پاس جائیدادیں کن خدمات کے صلے میں آئیں؟ کیا اس خدمتکے صلے میں کہ انہوں نے لوگوں کی اندھی عقیدت کو انگریزوں کی حمایت کے لئے استعمال کیا تھا؟ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۲)

مغربی فکرو تہذیب

محمد عمران خان[۱]

مغرب کا مشینی انقلاب

اور مغربی واسلامی معاشرے پراس کے اثرات

دورِ حاضر کا انسان کہیں زیادہ ابہامات (Ambiguities) اور غیر یقینی صورتحال کا سامنا کر رہا ہے ۔انفرادی ہوں یا اجتماعی ، عالمی معاملات میں قطعیت (Accuracy) کا شدید فقدان ہے۔یقین وایمان ناپید ہے،شکوک وشبہات اور ارتیابیت سے فضا مکدر ہے۔جدید علوم ومعلومات اور اطلاعات واصطلاحات کی ایک بے ہنگم یلغار ہے جوایک جانب فرد کواگر بے چین، ڈپیریسڈ،neurotic سے psychotic بنارہی ہے تو دوسری جانب سماج سے ایمان ویقین اور قناعت واطمینان کی دولت چھین کراسے جماعت سے ہجوم(mob) میں بدل رہی ہے۔ فرد میں خود پرستی(Selfishness)،حرص(Greed)،حسد(Jealousy)،شہوت(Sexuality)اور غضب(Violence تشدد) جیسے اخلاق رذیلہ بسرعت نشوونما پارہے ہیں۔سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مجھے خدشہ ہے کہ ہماری آئندہ نسل کی اکثریت Unwed Births/illegitimate بچوں پر مشتمل ہوگی۔گھر کی اہم ترین شے بجائے انسان کے الیکٹرانک آلات(Electronic appliances)ہیں اور گھر کا ماحول میڈیا مرکز (Science/Fiction Entertainment)بن چکا ہے۔تعلیمی نصاب کی بنیادی خصوصیت خالص Materialistic approach ہے بزنس مائنڈڈ اور نابغہ روزگار بچہ (Gifted learner Child) کا خواہش منداور بارسوخ سرمایہ دار طبقہ اسکولوں پرخاص نظر رکھتا ہے کہ ان سے کیسے نوجوان نکل رہے ہیں۔معاشرے میں بقااور ترقی کرنے کا اصول بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے ڈارونی تصور پر مبنی ہے۔معیار زندگی کو بلند کرنا ھل من مزید کا شیطانی چکر(Vicious Cycle)ہے۔ملٹی نیشنل کمپنیز Corporatocracy کا سرمایہ اس قدر ہے کہ وہ کئی کئی ترقی پزیر ممالک خرید سکتے ہیں(دیکھیے: جان پرکنز کی کتابیں)۔تزکیۂ نفس سے عاری ظاہری مذہبیت،فرد ومعاشرے میں مثبت اثرات منتقل کرنے کی بجائے منفی تاثر چھوڑ رہی ہے نیز ذرائع ابلاغ (Media) کے مذہب مخالف پروپیگنڈہ نے اس

---

[۱] Imrann2010@gmail.com 0341-2181148

روبہ زوال مذہبیت کو تیز تر کردیا ہے۔

جدیدیت ومغربیت

جدیدیت (Modernism) کی موجودہ صورت مغربیت (Westernism) ہے۔ مغربیت کا اصل الاصول ''ناآسودہ خواہشات اوران سے جنم لینے والا تصورِ آزادی'' ہے۔فرد کے اس مادر پدر تصورِآزادی سے ''سرمایہ کی آزادی'' نے جنم لیا ،جس کا براہ راست و بدیہی (Intrinsic) تعلق ''جدید سائنس وٹکنالوجی'' سے ہے۔جدیدیت کہتی ہے انسان جو چاہے خواہش کرسکتا ہے وہ کسی کا پابندنہیں آزاد ہے ،اسے کسی الہامی ضابطے(Revealed Doctrine) کا پابند ہرگزنہیں کیا جاسکتا۔قرآن کہتا ہے ''پھر اگر یہ تمھاری بات قبول نہ کریں تو جان لوکہ یہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں اوراس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جواللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے ، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'' (القصص:50)مزید وضاحت کی گئی: ''لوگوں کوان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اورسونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اورنشان لگے ہوئے گھوڑے اورمویشی اورکھیتی باڑی زینت دارمعلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیاہی کی زندگی کے سامان ہیں اوراللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے'' (آل عمران :14)۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخ خواہشاتِ نفسانی سے ڈھک دی گئی ہے اور جنت مشکلات ودشواریوں سے ڈھکی ہوئی ہے'' (صحیح بخاری، کتاب الرقاق)۔

مغربیت کہتی ہے جنت کی خواہش واعمال چونکہ سرمایہ میں اضافہ نہیں کرتے لہذا یہ طرز فکرو عمل بے کار ہے اوراگر بذریعہ جہادوقتال ہوتو نقصان دہ۔اگرخواہش تو جنت میں جانے کی ہے لیکن اعمال،سرمایہ میں کم وبیش اضافہ کا موجب ہیں تو یہ خواہش بھی قابل قبول ہے۔گویا اگرفرد یا جماعت کی خواہش وعمل سرمایہ کی بڑھوتری میں رکاوٹ نہ بنیں تو قابل قبول ہیں ۔سرمایہ دارانہ زندگی یانظام کورد کرنے کی اجازت ہرگزنہیں دی جاسکتی۔ہندو یا عیسائی کا مسلمان ہوجانا، چرچوں کا مساجد میں بدل دیا جانا بھی قبول مگرمجاہد یا انقلابی ناقابل برداشت۔افغان طالبان کوقومی دھارے میں لانے کی کوشش اس کی حالیہ مثال ہے۔اسلامی بینکنگ کی تو اجازت ہوسکتی ہے اسلامی نظامِ معیشت کی قطعی نہیں (اسلامی بینکنگ کے تنقیدی جائزے کے لیے دیکھیے: مروجہ

اسلامی بنکاری از رفقاء دار الافتاء بنوری ٹاؤن؛ غیر سودی بنکاری ایک منصفانہ جائزہ از مفتی احمد ممتاز؛ غیر سودی اسلامی بنکاری، از سالم اسلام ایڈووکیٹ) ۔بازارِ حصص (Stock Market) میں اگر دو ایسی کمپنیاں ہیں جن میں سے ایک جائے نماز بناتی ہے دوسری فحش فلمیں، تو بازار (Market) میں ان کے کاروبار (Manufacturing) پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جائے گا بلکہ ان کا منافع دیکھا جائے گا۔ بامنافع کاروبار ہی بازاری مسابقت میں برقرار رہ سکے گا اور کامیاب بھی اور اسے فطری طرزِ عمل قرار دیا جائے گا۔ جدیدیت و مغربیت، سرمایہ، صنعت کاری، سائنس و ٹکنالوجی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ تحریکِ تنویر (1685_1815) Enligtenment وہ فلسفیانہ، سیاسی اور سائنسی اپروچ تھی جو جدید مغرب (Western Society) کی بنیاد بنی۔ آکسفورڈ ڈکشنری تحریک تنویر کی یوں وضاحت کرتی ہے:

ENLIGHTENMENT: The period in (long) 18th century when many writers & scientists began to argue that science & reason are more imporant than religion & tradition.

(ترجمہ: اٹھارویں صدی کا وہ زمانہ کہ جب لکھاریوں و سائنسدانوں نے سائنس و (عقلی) استدلال کو مذہب و روایات سے زیادہ اہم یا بنیادی قرار دیا)۔ انقلابِ امریکہ (1765_83) اور انقلابِ فرانس (1789_99) کے بعد یورپ نے ''سرمایہ دارانہ نظام'' Capitalism کو اختیار کر لیا جبکہ جدید سائنس و ٹکنالوجی کا سنگ بنیاد ''صنعتی انقلاب'' (Industrial Revolution 1760-1840) بنا، جو درحقیقت دستکاری (Hand Production) سے مشین کاری (Machine Production) کی جانب جست تھی یعنی ایک ''مشینی انقلاب'' کی طرف۔

مشینی انقلاب کا تاریخی پس منظر

مشینی انقلاب نے انگلستان کی زرعی معاشرت (Agrarian Society) کو صنعتی سماج (Industrial Society) میں بدل دیا۔ برٹش ماہر معاشیات اور مشیر برائے پالیسی میکنگ آف برطانیہ و امریکہ باربرا وارڈ (1914_81ء) کہتی ہیں: اس تہذیب (مغرب) سے وابستہ سائنس و صنعت کی ایسی دو قوتیں وابستہ ہیں جو زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کر دیتی ہیں۔

اس سے صرف تنظیم اور طریق کار میں ہی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ بنیادی طور پر عادات اور انسانی طرز عمل کو بھی بدل دیتی ہیں۔تاریخی پس منظر بتاتے ہوئے لکھتی ہیں ۔ایشیا کے برعکس یورپ غربت کے مسائل سے دوچار تھا۔ یہاں زیرزمین معدنی دولت موجود نہ تھی۔ یورپین بہتر بودوباش کے لئے بحیرہ روم اور ایشیا پر انحصار کرتے تھے۔ یورپین کے پاس ریشم، جواہرات اور عطریات کے معاوضہ کے لئے کچھ نہ تھا۔ یہ افراط زر کا خواب ہی تھا جو یورپین کو راس امید (جنوبی افریقہ) کے گرد چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچنے، جاپانی معدنیات کی کانوں اور کولمبس کی بحراوقیانوس کی طرف کشش کا سبب بنا۔نظریہ صنعتیت کا ''آزادی عمل''(Freedom) سے براہ راست تعلق ہے۔ہل کی پنجالی، بیل کی گردن کی بجائے گھوڑے کی گردن کے مطابق بنانا اور بادبانی چکیاں نصب کرنا جیسی ایجادات (صنعت) اس غرض سے تھیں کہ انسان کی حرصِ اراضی (Land Greed) کی قوت کو مزید تقویت دے کر نفع اندوزی (Profit Gaining) کو لامحدود کیا جاسکے۔ نفع اندوزی سے یہی مقصود ہے کہ خسارے (Deficits) کے امکانات سے محفوظ رہا جائے۔ اثاثوں (Assets) میں لامحدود اضافہ اور واجبات (Liabilities) میں لازمی کمی۔

مغرب میں صنعتی ترقی کی بنیادی وجوہات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں: سترہویں صدی میں برطانوی ذہن میں مذہب کی بجائے طبعی سائنس کا عام رجحان صنعتی انقلاب کا پہلا مرحلہ تھا۔مگر اس قسم کی انقلابی ذہنی تبدیلی ہندوستان میں نہ ہوئی اس کا سبب مذہب (اسلام) تھا جو کہ کائنات کے فانی ہونے کی تلقین کرتا ہے (یاد رہے مذاہب کا عقیدہ جزاوسزا و آخرت، مادی زندگی کے لئے حد سے بڑھی دوڑ دھوپ کی حوصلہ شکنی کرتا ہے)۔اس لیے ہندوستان میں تحقیق و ایجاد کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ ثقافت اور معاشی حالات کے عمل کا براہ راست تعلق سائنس اور صنعت کاری سے ہوتا ہے۔ صنعتی میدان میں ترقی کی ابتدا کرنے والی قوم یعنی برطانیہ اس لیے خوش قسمت تھی کہ اسکے لئے ''سرمایہ'' موجود تھا۔ اور یہ سرمایہ (Capital) نئی دنیا (برطانوی کالونیز) سے یورپ منتقل ہورہا تھا گویا مسلسل ترسیلِ سرمایہ یورپ کی سائنسی و صنعتی ترقی کا فیصلہ کن محرک تھا۔ یاد رہے سرمایہ (Capital) اور مارکیٹ (Market) کا آپس میں لازم وملزوم کا رشتہ ہے اور یہ کہ جدید مارکیٹ روایتی بازار (Conventional Bazar) سے مختلف شے ہے۔ برطانوی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کنگھم نے لکھا کہ برطانیہ میں اس زمانے میں اتنے بڑے پیمانے پر ایجادیں صرف اس لئے نہیں ہونے لگی تھیں کہ جیسے لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی

ہو بلکہ اصل وجہ اس ملک میں سرمایہ کا اتنا اکٹھا ہو جانا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔خواہشات اور ترقی ۔صنعتی انقلاب اور استعماریت (سامراجیت/نوآبادیاتی نظام) (Imperialism) اور بیوپاریت (Mercantilsim)، سیکولرازم وغیرہ کا سرخیل سرمایہ دارنہ نظام (Capitalism) ہے سرمایہ داری کی حقیقت کے لئے ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، سید خالد جامعی اور زاہد صدیق مغل وغیرہم کی تحقیق دیکھیے)۔

(ا) حصولِ سرمایہ کا بیرونی ذریعہ: ایشیاء (ہندوستان وچین)

صنعتی انقلاب کو آگے بڑھانے میں ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا بہت بڑا حصہ تھا۔سر ولیم ڈِگبی کے اندازے کے مطابق پلاسی کی جنگ (1757ء) سے لے کر واٹر لو کی جنگ (1815ء) تک انگریزوں نے ہندوستان سے 50 کروڑ سے لے کر ایک ارب پاؤنڈ تک خزانہ سمیٹا۔ ہندوستانی اجناس پر مکمل پابندی لگائی گئی۔ہزاروں ہندوستانی جلاہے (Weavers) بے روزگار ہو گئے بقول نہرو کروڑوں موت کا شکار ہوئے۔لارڈ بینٹک کہتا ہے تجارت کی تاریخ میں ان کی بدحالی وافسردگی کی مثال نہیں ملتی۔1772ء میں ولیم بوسٹس نے بتایا کہ کمپنی کے گماشتے بازار سے 40٪ تک کم نرخ مقرر کرتے ہیں ریشم کاتنے والے بے شمار کاریگروں نے ان تکالیف سے تنگ آ کر اپنے انگوٹھے تک کٹوا لیے۔نہرو نے مزید لکھا کہ ہندوستان جدید صنعتی سرمایہ داری کا آلہ کار بن کر رہ گیا اور اس کے تمام امراض کا شکار ہوا۔جب ایسٹ انڈیا کمپنی 1858ء میں برطانوی تاج کے حق سے سبکدوش ہوئی تو اس نے افغان جنگوں اور سکھوں کے ساتھ جنگوں کی وجہ سے اکٹھا کیا ہوا سات کروڑ پاؤنڈ کا قرض انگریز حکومت کے حوالے کیا۔1858ء سے قبل سالوں میں نذرانے کے طور پر کل ڈیڑھ ارب پاؤنڈ برطانیہ بھیجے گئے لیکن راج کے آخری سالوں میں ہر سال ڈیڑھ ارب پاؤنڈ تک برطانیہ کو ارسال کئے جاتے تھے۔المختصر برطانیہ نے پاک وہند سے اس کی تاریخ چھین لی، اس کے سماج کی پیداواری قوتوں کو پابند کر کے سامراجی مفادات کے ماتحت کر دیا۔ایک خود کفیل دھرتی کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی تقسیم محنت میں خام مال فراہم کرنے والا، مصنوعات اور مشینری درآمد کرنے والا مفلوج ملک بنا دیا گیا۔ اپنی مقبوضہ جات (Colonies) میں برطانوی سرکار نے اپنے مفادات کے لیے گماشتے، بنیے، تاجر، جاگیردار، سرمایہ دار، ماہرینِ تعلیم کے علاوہ افسر شاہی اور تابعدار فوج تشکیل دی۔مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی 1948ء کی رپورٹ کے مطابق پنجاب اور سرحد (خیبر پختونخواہ)

کے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں میں سے کسی کا بھی حق ملکیت 1857ء سے قبل کا نہیں ملتا۔ یہ زمینیں جنگ آزادی میں سرکار بہادر کی مدد کا صلہ اور انعام تھیں۔ برطانوی ہند کی اقتصادی تاریخ کا مصنف رمیش دت کہتا ہے کہ ایک غریب قوم کے مالیہ سے دنیا کی امیر ترین قوم کو ہر سال مزید دولتمند بنایا جاتا رہا۔ فاکس ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے ایڈمنڈ برک نے کہا کہ "ہر وہ روپیہ جو انگریز نفع میں حاصل کرتا ہے دراصل ہندوستان کا نقصان ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال (جسے سرسبز کوچہ کہا جاتا تھا) کو مرکز بنا کر سرکاری سطح پر منشیات (Drugs) کے کاروبار کا آغاز کیا۔ چنانچہ وہ کثیر سرمایہ جو برطانیہ سونے اور چاندی کی شکل میں چین کو دے رہا تھا اس سے کہیں زیادہ سرمایہ انہوں نے چینی قوم کو بھنگ، افیون اور دوسرے نشوں میں مبتلا کر کے واپس وصول کرنا شروع کر دیا۔ منشیات کے باعث دو تا تین دہائیوں میں تین کروڑ چینی لقمہ اجل بن گئے۔ منشیات کی جنگوں (Opium Wars) میں شکست کے نتیجہ میں چین کو اپنی بندرگاہیں مجبوراً برطانیہ کو دینی پڑیں جنھوں نے چینی شہروں میں اپنے تجارتی مراکز بنائے اور اس قوم کو بھنگ اور افیون کا عادی بنا دیا۔ ڈرگ اسمگلر سلطنتِ برطانیہ نے لاکھوں کی چائے کے بدلے کروڑوں کی افیون فروخت کی۔ ماؤزے تنگ (1945-76) نے دو تین سالوں میں منشیات فروشوں اور نشے کے عادی افراد سے چین کو چھٹکارا دلایا۔ افیون سے ہیروئن اور کوکین مغربی دواساز کمپنیوں نے بنائی۔ یاد رہے دورِ حاضر کی بڑی معیشتوں کے تین بڑے کاروبار تیل، ہتھیار اور منشیات ہیں۔ سوویت یونین کے دور میں افغانستان منشیات کی بڑی فیکٹری بن گیا تھا، ڈرگ ٹریڈنگ میں امریکی خفیہ ایجنسی CIA کا نام سرفہرست ہے (مورخ Alfred McCoy اور میکسیکن جرنلسٹ Anabel Hernndez وغیرہ کی تحقیق دیکھیے)۔ دورِ طالبان 1995 تا 2001ء میں افیون کی کاشت تقریباً ختم کر دی گئی تھی۔

(۲) حصولِ سرمایہ کا اندرونی ذریعہ: صیہونی بینکرز

ایسٹ انڈیا کمپنی (1600-1858ء) کو اندرونِ خانہ سرمایہ صیہونی (ریاست اسرائیل کا حمایتی یہودی) بینکرز فراہم کر رہے تھے۔ وہی بینکرز بینک آف انگلینڈ (1694ء) کے ذریعے برطانوی حکومت کو قرضے دے رہے تھے۔ بینک آف انگلینڈ جو ایک نجی انٹرپرائز تھا، بعد ازاں Ruthshields جرمن یہودی کے مکمل قبضے میں چلا گیا۔ برطانوی ملکہ الزبتھ کے شیلڈ کے ساتھ

بہت قریبی تعلقات اور رشتہ داریاں بھی رہیں (یاد رہے کمپنی نے رائل چارٹر ملکہ الزبتھ اوّل سے حاصل کیا تھا)۔ یورپ میں یہودی قرضہ وسود کا عکس شیکسپیئر کے ڈرامے 'مرچنٹ آف وینس' (Merchant of Venice) کے مشہور کردار 'شائی لاک' (Shylock) اور کرسٹوفر مارلو کی کتاب *The Jews of Malta* سے بخوبی ہوتا ہے۔فری مسینری کلٹس (Freemason Cults) ظاہراً لادین لیکن درحقیقت یہودی وصیہونی تھے۔ یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے، یہاں اس کا موقع محل نہیں (کچھ مفید کتب وحوالے: فری میسنری اور دجال از کامران رعد؛ مفتی ابو لبابہ شاہ منصور کی کتب ؛ مولانا عاصم عمر کی کتب ؛ایک مختصر ویڈیو لنک: https://www.facebook.com/WorldHistorys/videos/280455032142999/).

یہودیت اور سود

قاموس الکتاب (لغاتِ بائبل جو رومن کیتھولک عیسائیوں کی مستند ہے) میں مولف لکھتا ہے: ''سود لینا کسی کو کاٹ کھانے کے مترادف ہے۔عہد نامہ عتیق (Old Testament) (یہودی کتاب مقدس) میں شکایت یہ نہ تھی کہ سود کی شرح بہت زیادہ ہے بلکہ یہ کہ سود لیا ہی نہ جائے۔ ذیل کے تینوں حوالوں میں سود لینا منع ہے (خروج ۲۲:۲۵؛ استثناء ۲۳:۱۹؛ مابعد اور احبار ۲۵:۳۵ مابعد)۔ بقول یہود، یہودی غیر یہودی (goyim یا Gentile) سے سود لے سکتا ہے لیکن قرآن نے اس یہودی طرز عمل کی مذمت کی ہے (سورۃ النساء 160۔161)۔

عیسائیت اور سود

حضرت عیسیٰؑ بیت المقدس (عبادت گاہ) میں داخل ہوئے تو عبادت گاہ میں سود خوروں (Monoey Lenders) نے اپنی میزیں سجا رکھی تھیں (نئی کتابوں میں ان کے لیے منی چینجرز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے)۔ یہ سارا کام یہودی سرپرستی میں جاری تھا۔حضرت عیسیٰؑ جو نہایت منکسر المزاج طبیعت کے مالک تھے جلال میں آگئے اور انھوں نے سود خوروں کی میزیں الٹ ڈالیں اور کہا کہ یہ دعا کا گھر ہے اور تم نے اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بنا دیا ہے (متی کی انجیل: 21۔12)۔ یاد رہے دورِ حاضر میں عیسائیوں کے ہاں سودی اسکیم کے بارے میں مختلف آراء موجود ہیں۔

صنعتی ترقی اور اندرونِ یورپ ردعمل

برطانوی ٹکسٹائل مِل ورکرز (Luddites 1811-1816) نے اس مشینی برتری کے

خلاف مہم چلائی اور ''مشینوں'' کو توڑا پھوڑا جس کی پاداش میں انہیں سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا۔ جی ہاں Capital Punlshmeht کا۔ یہ بات بھی علم میں رہنی چاہیے کہ بانی کمیونزم کارل مارکس (1818۔83) نے سرمایہ داری کی تو مخالفت کی لیکن خود کو فخریہ سائنسدان کہا، مشین اور سائنس و ٹکنالوجی کے بجائے سرمایہ دار کو ہدف تنقید بنایا۔ وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ سائنس و ٹکنالوجی (Techno Science) کا اصل تعلق سرمایہ (Capital) سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے سوویت یونین نے بائیولوجیکل و اسٹرانومیکل سائنسز میں تو خوب ترقی کی مگر دوسری طرف ان کا جو اصل ہدف تھا یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا قلع قمع، اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ سوویت یونین کی تحلیل دنیا نے چند دہائیوں کے بعد ہی دیکھ لی۔ 1980ء میں محنت کش طبقہ (Proletariat) کی پولش ٹریڈ یونین Solidarity Movement کمیونزم کے انہدام کی نمایاں وجہ تسلیم کی گئی۔ مارکس یہ سمجھتا تھا کہ اگر سائنس کو سرمایہ دارانہ نظام سے الگ کر دیا جائے تو اس سے ''خیر'' برآمد ہوگا، جسے تجربہ نے باطل قرار دے دیا۔ کمیونسٹ چین کا سرمایہ دارانہ نظام کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اظہر من الشّمس ہے۔

یاد رہے مستند سائنسدان اسٹیفن ہاکنگ نے مشینوں Thinking Machines(Artificial Intelligence) کو اس دنیا کے خاتمہ End of World کی ایک وجہ قرار دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی مخالفت میں وہ جو تجویز دیتا ہے وہ بھی اصل قضیہ کی بجائے اس کے نتائج کو روکنے کی ناکام مغربی ذہنیت کا شاہکار ہے۔ ایک عالمی حکومت کا قیام۔ کیونکہ جدیدیت و مغربیت پر سوال نہیں اٹھایا جاتا کہ یہ ایمان کا معاملہ ہے (ژی ژیک کہتا ہے ماڈرن ازم ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے پہلے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا)۔ انسان اور مشین کی کشاکش کا فلمی اظہار Robot, The Matrix,The Terminator وغیرہ کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔

امت مسلمہ اور جدیدیت

امت مسلمہ ''جدیدیت'' کی گزشتہ تمام صورتوں سے سرخرو نکلی ہے۔ قاضی ابراہیم بن محمد تیمی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فتنۂ ارتداد کا خاتمہ کیا، خلیفۂ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے امت کی تجدید کی، خلیفہ متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید نے بدعت کو

مٹا کر سنت کو زندہ کیا۔ امام اشعریؒ نے معتزلہ کو شکست دی تو امام غزالیؒ نے یونانی فلسفہ کی علمی یلغار کو روکنے میں بے مثال کردار ادا کیا۔ اس حوالہ سے امام فخر الدین رازیؒ، امام ابن تیمیہؒ، علامہ تفتازانیؒ، امام الحرمین ابو المعالیؒ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ محقق سید خالد جامعی کہتے ہیں کہ جدیدیت کا علمی سطح پر آغاز اس امت میں خوارج سے ہوا جنھوں نے عقل کی بنیاد پر اپنے نقطہ نظر کی بنیاد قائم کی اور پھر عقل کے سہارے مختلف قضایا(Narratives) قائم کرتے چلے گئے۔ خوارج کے عقلی مکتب فکر کے باعث امت میں افتراق وتفریق کا ہنگامہ خیز سلسلہ شروع ہوا اور عقلی موشگافیوں کے ذریعے شریعت اور عقائد کے ابواب میں اختراعات ، بدعات و تنازعات کا لامتناہی سلسلہ در آیا جس نے یونانی فلسفہ کی رنگ آمیزی کے بعد ایک مجتہدانہ اور عالمانہ رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ برصغیر میں اسلامی جدیدیت کا سہرا سر سید احمد خان کے سر سجتا ہے جنہوں نے معتزلہ کے انداز میں عقلی متکلمانہ اصولوں کے تحت اسلام کی از سرِ نو سمت متعین کرنے کی کوشش کی اور مغربیت کو پاک و ہند میں علمی جواز عطا کیا۔ مولانا فراہیؒ و اصلاحیؒ کے جانشین جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے معتقدین اسی فکر کا تسلسل ہیں۔

مشینوں کی انسان سے ربط و تعلق کی نوعیت

۱۔ جدید ٹکنالوجی انضباط پذیر(Governable Technology) ہے۔

اولڈ ٹیکنالوجی کی شرائط(pre-requisite) فطرت(Nature) میں ہی موجود تھیں مثلاً گھوڑے یا خچر کے لیے گورنمنٹ کے کسی انتظام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی خوراک(گھاس پھوس اور پانی) موجود ہے، وہ ہر طرح کی زمین پر بآسانی بار برداری وغیرہ کا کام کرسکتا ہے، اس کا فضلہ بطور کھاد اور جلانے میں استعمال ہوسکتا ہے۔ جب چاہیں اسے ذبح کر کے کھا کر برابر کردیں، کوئی ماحولیاتی مسئلہ جنم نہیں لیتا۔ اس کی کھال بھی فائدہ مند ہے۔ اس کے برعکس ''موٹر کار'' جس کی کئی ایک Pre-requisites ہیں۔ یہ ایک Dependable Utility ہے۔ اس میں ریاستی مداخلت ناگزیر ہے، اس کی خریداری، رجسٹریشن، لائسنس، انشورنس، ٹریفک پولیس اور قوانین وغیرہ۔ سڑکیں، پیٹرول پمپ، ریپئیرنگ شاپ، آٹو پارٹس، غرض مداخلت کاروں(Human interferers) کی ایک طویل فہرست ہے۔ مشین کی Carbon emisison اور Fuel burning ماحولیاتی آلودگی کا بڑا سبب ہے، گلوبل

وارمنگ دنیا کی بقا کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔

۲۔جدید سائنس وٹکنالوجی فرد کو گرد و نواح سے لاتعلق (Detach) کرتی ہے

جدید ٹکنالوجی فرد کو زمان و مکان سے الگ detach کر دیتی ہے مثلاً موبائل فون کی مسجد میں ringing یا vibration فرد کو اپنے رب سے فوراً منقطع کر دیتی ہے، گھر میں موبائل فون ہولڈر تمام اہل خانہ کے درمیان موجود ہونے کے باوجود اپنے ماحول (Surrounding) سے لاتعلق ہو جاتا ہے، برابر بیٹھا فرد بھی اس کی سرگرمی سے لاعلم رہتا ہے۔ سماج اور کتاب سے تعلق توڑنے میں موبائل فون کا منفی کردار معلوم حقیقت ہے۔ تلوار بمقابلہ ڈرون طیارہ کا فرق اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ موریہ اشوکا (232-268ق م) نے کالنگا جنگ کی شدید قتل و غارت کے بعد بدھ ازم اختیار کر لیا کیونکہ وہ جنگ میں بذاتِ خود (Subjectively) موجود تھا جبکہ جدید ڈرون کنٹرول کرنے والے انسانوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور اس کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں کرتے۔ روایتی جنگ میں فرد کی قابلیت نظر آتی تھی۔ وہ Subjective Violence تھا۔ عراق پر صرف پابندی لگا کر ایک لاکھ بندے مار ڈالے گئے، اور اسے Constructive violance کا نام دیا جاتا ہے یہ Objective Violence ہے۔

۳۔سائنس وٹکنالوجی کا زمانی، مکانی اور جمالیاتی پہلو Aesthetic Traditional perspecitve

پرانی ٹکنالوجی Culture Specific اور Local (علاقائی) ہوا کرتی تھی. میدانی علاقہ کی اپنی ٹکنالوجی تھی، صحرا کی اپنی اور پہاڑی علاقہ کی اپنی۔ اونٹ اگر صحرا کا جہاز تھا تو گائے ہندوستان کی ماتا، اجرامِ فلکی (سورج، چاند، ستارے) اگر عراق میں مرکزِ عبودیت تھے تو مصر میں دریائے نیل مرکز حیات۔ چین میں آبا پرستی (مردہ پرستی) محور تھی تو یونان میں خیال پرستی (عقل) اور روما میں شاہ پرستی، جبکہ جدید تہذیب سائنس پرست (Scientism) ہے، Techno-science اس کا فوکل پوائنٹ، یعنی گزشتہ تمام تہذیبوں سے مختلف، فطرت سے دور اور مصنوعات کی پجاری تہذیب۔

قبل ازیں فرد و معاشرہ پر مظاہرِ فطرت ظاہر و عیاں تھے لہٰذا اس کے خالق و مالک کا عرفان

و رسائی اور شکر گزاری کے امکانات بھی روشن تھے، انسانی کاریگری یا مصنوعات (Artifacts) کا دائرہ محدود تھا لہٰذا فرد، موجد سے سائنس و سائنسی ترقی اور اس کی Discovery/Invention سے کم متاثر ہوا کرتا تھا۔قرآن حکیم (سورۃ الانعام:74۔83) میں اللہ کے دوست حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ نقل کرتا ہے کہ کس طرح انہوں نے آسمان و زمین کے عجائبات (ستارے، چاند، سورج) دیکھے اور الٰہ شناسی سے فیضیاب ہوئے۔یہ ٹکنالوجی حسن و جمال کو مہمیز (spur) کرتی ہے۔نت نئی Innovations ہیں چاہے وہ Dress designing ہو یا constructions۔منفرد سیلفی (selfie) اتارنے میں جان جوکھوں میں ڈالی جارہی ہے۔

کتابیات

۱۔مغرب اور عالم اسلام کی فکری وتہذیبی کشمکش اور مسلم اہل دانش کی ذمہ داری از مولانا محمد عیسیٰ منصوری

۲۔معاشی دہشت گردی از زید حامد

۳۔سامراج اور پاکستان از پروفیسر ڈاکٹر فیروز احمد اپ ڈیٹ کاشف فراز احمد

۴۔کمپنی کی حکومت از باری علیگ

۵۔Five Ideas that chaged the World by Barbara Ward

۶۔تاریخ یورپ از چوہدری محمد صادق و پروفیسر محمد اکرم سعید

۷۔چین۔سرمایہ دار یا سوشلسٹ از ڈاکٹر لال خان (کالم۔دنیا نیوز)

۸۔اسلام اور جدیدیت کی کشمکش از محمد ظفر اقبال

۹۔سرمایہ داری نظام ایک تعارف از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

۱۰۔عالم اسلام، روایت وجدیدیت کی کشمکش (حصہ اول) از سید خالد جامعی

۱۱۔لیکچرز از محمد فصیح آف کراچی یونیورسٹی

۱۲۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت از پروفیسر عزیز احمد مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی

۱۳۔ماہنامہ ساحل ۱۴۔لغات وانٹرنیٹ

۱۵۔ڈاکٹر اسرار احمد (لیکچرز)۔۔۔وغیرہ

تزکیۂ نفس

احمد اعوان [۱]

معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ

کیا یہ شرعی تقاضا ہے؟

اسلامی روایت کا ایک منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں جو آدمی دین دار ہوگا جو آدمی بزرگ ہوگا، اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ کم سے کم دنیا لے گا۔ جو معیار زندگی میں جتنا کم ہوگا وہ ہمارے مذہب میں اتنا ہی بلند ہوگا۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک معجزہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی کو ایک غریب آدمی اپنانا چاہے تو اپنا سکتا ہے اور ایک ارب پتی کی طرح زندگی گزارنا چاہیے تو گزار سکتا ہے۔ انبیاء کرام معاشروں کے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سادہ زندگی کسی نے نہیں گزاری، اگر آپ کے شب وروز کو دیکھا جائے اور اپنا معیارِ زندگی دیکھا جائے تو سر مارے ندامت اور شرمندگی کے جھک جاتا ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں ان لوگوں پر جو کہتے ہیں اسلام ترقی سے اور معیار زندگی بلند کرنے سے کب منع کرتا ہے؟ اصل سوال یہ ہے کہ اسلام اچھا معیار زندگی اور ترقی کرنے کا حکم کب دیتا ہے؟ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث مبارکہ میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ۲، ۴ صحابی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے کیے ہوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ ان کو بھی اپنے ساتھ لگالیں اور ان کو بھی امیر ہونے کے گر سیکھا دیں تاکہ مسلمانوں کے معاشی حالات بدل جائیں۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔

لیکن آج جس مسلمان سے معیار زندگی کم کرنے کی بات کی جائے وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر فوراً سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے دفاع کے لیے سامنے لے آتا ہے حالانکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اگر خود پر ایک لاکھ خرچ کرتے تھے تو امت پر دس کروڑ خرچ کرتے تھے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سود کے لین دین کے بغیر امیر تھے۔ آج کا مسلمان دس کروڑ خود پر خرچ کرتا ہے اور ایک لاکھ امت پر خرچ کر کے مثال سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی دیتا ہے۔ اگر کوئی آدمی امیر ہے تو اسلام اس کو منع نہیں کرتا مگر امیر ہونے کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتا بلکہ ہر وقت آخرت کی بات کرتا

---

[۱] بشکریہ جسارت، کراچی

ہے۔ دنیا سے کم سے کم لینے کی بات کرتا ہے۔ آج کے امیروں سے سوال کریں کہ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کی کیا مدد کرتے ہیں تو وہ بتاتے ہیں کہ ہم اپنے پرانے کپڑے پھینکتے تو نہیں ہیں بلکہ وہ ہم اپنے ان ہی غریب رشتہ داروں کو دیتے ہیں۔ اسی طرح اپنا بچا ہوا کھانا بھی غریبوں کو دے دیتے ہیں۔ آج کے مسلمانوں کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ وہ امیر ہونے کے لیے تڑپتے، ترستے اور کڑھتے رہتے ہیں۔ ہم باتیں کرتے ہیں امریکا کو تباہ کرنے کی اور خود غریب رہنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ امریکا کے پاس ایٹم بم سے بڑا ہتھیار ترقی کا ہے اور اس کو آج امت مسلمہ میں کوئی ہتھیار سمجھتا ہی نہیں۔ سب فرعون جیسی عیاشی اور موسیٰؑ جیسا خاتمہ چاہتے ہیں اور یہ دونوں ایک ساتھ میسر نہیں آسکتے۔

نبی کریم ﷺ نے غریبوں کو خوشخبری دی کہ وہ قیامت کے روز غریبوں کے ساتھ جنت میں جائیں گے اور غریب امیروں سے ہزاروں سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ مگر پھر بھی آج کا ہر مسلمان امیر ہونا چاہتا ہے۔ کیوں؟ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہبی لوگوں اور علماء کرام نے امیر ہونا شروع کر دیا ہے۔ اور یہ سب اس ملک میں ہو رہا ہے جہاں راوی کے پل سے ایک ماں اپنے تین بچوں کے ساتھ کئی روز کی بھوک سے تھک کر دریا میں کود گئی۔ کیا ہزاروں کا سوٹ پہننے والی اسلام پسند خواتین و حضرات اور لاکھوں مالیت کی گاڑیوں میں سفر کرنے والے علماء کرام کل قیامت کے روز پل صراط پر راوی میں ڈوبی عورت اور اس کے تین بچوں کا سامنا کرنے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے تیار ہیں؟

ضرورت کمپوزر

البرہان کو ایک فل ٹائم / پارٹ ٹائم کمپوزر کی ضرورت ہے جو درس نظامی کا فاضل ہو، اُردو عربی کے علاوہ انگریزی کمپوزنگ اور کچھ ڈیزائننگ کی مہارت رکھتا ہو۔

درخواستیں البرہان کے پتہ پر بھیجیں یا ای میل کریں۔

(ادارہ)

مطالعۂ کتاب پروفیسر ملک محمد حسین/ ڈاکٹر محمد امین

’تعلیم، امن اور اسلام‘

امریکی سرمایہ، مجہول مرتبین اور مدارس کے معروف علماء کرام

ہمارے سامنے ایک کتاب ہے جس کا عنوان ہے "تعلیم، امن اور اسلام" درسی کتاب برائے اعلیٰ ثانوی درجات۔ کتاب کے ٹائیٹل پر نیچے دائیں طرف کسی ادارے "تحقیقات" کا لوگو ہے اور نیچے انگریزی میں لکھا ہے "Tehqeeqat Publishing" درمیان میں نمایاں حروف میں لکھا ہے "مجلس تحقیقاتِ اسلامی" ٹائیٹل کے اندرونی صفحہ پر لکھا ہے "انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور (IRCRA) کے ذیلی شعبہ مجلس تحقیقاتِ اسلامی نے علماءِ کرام کے تعاون سے تیار کیا۔ دائیں طرف ایک لمبی پٹی میں لکھا ہے "تحقیقی نتائج مجلس تحقیقات اسلامی" اور نظر ثانی محمد اسرار ابن مدنی اور مولانا محمد اخونزادہ۔

مذکورہ بالا اداروں اور دو حضرات کو جب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو محمد اسرار ابن مدنی اور مولانا اخونزادہ تو جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں دریافت ہو گئے لیکن انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور، اس کے ذیلی شعبہ مجلس تحقیقاتِ اسلامی، تحقیقات پبلشنگ (Tehqeeqat Publishing) اور وہ علماءِ کرام جن کے تعاون سے مذکورہ کتاب تیار ہوئی ان کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اظہارِ تشکر میں حضرت مولانا سمیع الحق، مفتی منیب الرحمان سے لے کر ڈاکٹر سفیر اختر، ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمن، ڈاکٹر محمد سلیم جیسے جدید سکالرز اور ماہرین تعلیم سے ہوتے ہوئے مولانا ڈاکٹر سید محمد نجفی اور محی الدین (اسلامی یونیورسٹی آزاد کشمیر) تک معروف اور مقتدر 26 علماءِ کرام کا نام دیے گئے ہیں جنہوں نے مذکورہ کتاب کے لیے کلماتِ تحسین عطا فرمائے۔ پیشِ لفظ کے آخر میں بریکٹ کے اندر (مرتبین) لکھا ہوا ہے لیکن مرتبین کون ہیں، اُن کے نام نامی اسمائے گرامی صیغہ راز میں رکھے گئے ہیں۔ کتاب مذکور کو ترتیب دینے والے مرتبین اور وہ سب ادارے جن کا ذکر ٹائیٹل پر ہے یا ٹائیٹل کے اندرونی صفحہ پر ہے، سب مجہول ہیں۔ نہ اُن کا اتا پتا ہے، نہ کوئی الیکٹرانی شناخت ہے اور نہ ہی کوئی رابطہ کے لیے فون نمبر وغیرہ دیے گئے ہیں۔ بس کلماتِ تحسین عطا کرنے والے 26 علماءِ کرام قابل شناخت ہیں اور نظر ثانی کرنے والے جامعہ حقانیہ

کے دو حضرات ۔ یہ بڑی اچنبھے کی بات ہے کہ "تعلیم، امن اور اسلام" جیسے اہم موضوع پر جو اعلیٰ ثانوی درجات کے لیے درسی کتاب شائع کی گئی ہے لیکن اس کو تیار کرنے والے اور تحقیقی نتائج مہیا کرنے والے مرتبین اور شائع کرنے والا ادارہ سب پردۂ اخفا میں ہیں جب کہ کتاب کے پیش لفظ میں اہل علم سے گزارش کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو بہتر بنانے میں اپنی تجاویز دیں۔ اب اگر اہل علم حضرات میں سے کوئی یہ چاہے کہ کتاب کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز دے تو وہ رابطہ کس سے اور کس طرح کرے کیونکہ سوائے کلماتِ تحسین عطا کرنے والے علماءِ کرام اور نظر ثانی کرنے والے دو حضرات کے، نہ کسی ادارہ کا کوئی پتہ ہے نہ مرتبین ہی قابلِ شناخت ہیں۔

ہم نے اس مجہول علمی کوشش کا سراغ ڈھونڈھنا چاہا تو خوش قسمتی سے وہ سراغ مل گیا۔ صورتِ حال جو اُبھر کر سامنے آئی وہ اس طرح ہے۔ امریکہ کا ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے "یوایس کمیشن فار انٹرنیشنل ریلجیس فریڈم" (US Commission For International Religious Freedom) جو بین الاقوامی سطح پر خصوصاً اسلامی ملکوں کے قوانین، دستور، نصاب، دینی مدارس اور تعلیم پر نظر رکھتا ہے اور تحقیقی رپورٹس تیار کر کے امریکی حکومت کو مطلع کرتا رہتا ہے اور بتاتا رہتا ہے کہ وہ مسلمان ممالک کی حکومتوں پر نصاب، تعلیم، قوانین اور مذہبی معاملات میں کن کن حوالوں سے دباؤ ڈال کر تبدیلیاں کرائے۔ اس کمیشن کے ذیلی ادارے کے طور پر ایک ادارہ بنام "ادارہ امن و تعلیم" (Peace and Education Foundation) کام کرتا ہے جس کا بہت زیادہ نفوذ پاکستان میں ہے۔ اس ادارے نے پچھلے کئی سالوں سے پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں اور نصابات پر تنقیدی اور تہدیدی رپورٹس شائع کی ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ بہت سی سفارشات پر عمل ہو گیا ہے اور کئی ایک پر عمل درآمد باقی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی چند سفارشات کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پاکستان کے سرکاری سکولوں میں جو درسی کتب پڑھائی جاتی ہیں اُن کا مواد غیر مسلم عقائد اور غیر مسلموں کے حوالے سے تعصب، بداعتمادی اور احساس کمتری پیدا کرنے کا باعث ہے۔

۲۔ پاکستانی نصاب اور درسی کتب میں طلبہ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے دو دشمن ہیں انگریز اور ہندو۔ یہ دونوں طبقے پاکستان بنانے کے خلاف تھے۔

۳۔ سکول ٹیکسٹ بکس جو تقریباً 41 ملین بچوں تک پہنچتی ہیں ان میں اقلیتوں کو منفی انداز

میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام ہی صرف حقیقی اور درست نظریہ ہے۔

۴۔ پورے نصاب میں اقلیتوں کے مذہبی عقائد کے خلاف تعصب اور عدم برداشت پر مبنی نظریات پڑھائے جاتے ہیں۔

۵۔ اسلام کا ثقافتی اور سماجی نظام ہندوؤں سے مختلف ہے اس لیے اُن کے ساتھ تعاون نا ممکن ہے۔

سفارشات:

USCIRF نے پہلے سے موجود سفارشات پر پانچ مزید نکات کا اضافہ کیا ہے:

۱۔ آئین میں مذہبی اقلیتوں کو جو تحفظ دیا گیا ہے اُسے نصاب میں بھی نظر آنا چاہیے۔

۲۔ طلبہ کو کوئی ایسا مواد نہیں پڑھانا چاہیے جس میں صرف ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت دی گئی ہو۔

۳۔ (Indoctrination) ختم ہونی چاہے اور غیر جانبدار مواد کا انتخاب ہو تاکہ طلبہ میں تنقیدی نقطہ نظر پیدا ہو۔

۴۔ یہ بات کہ اسلام ہی صرف سچا مذہب ہے، اسے درسی کتب کے مواد کا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔

۵۔ تاریخی غلطیاں اور تاریخ کی غلط تعبیر کو نصاب سے خارج کرنا چاہیے اور متنوع نقطہ نگاہ پیش کیا جانا چاہیے۔

کلماتِ تحسین کے عنوان کے تحت جس کے آخر میں کلماتِ تحسین عطا کرنے والے علماءِ کرام یعنی مفتی منیب الرحمان، مولانا عبدالمالک، مولانا سید نیاز حسین نقوی، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا یٰسین ظفر اور مولانا ڈاکٹر عطاء الرحمن کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ادارہ امن و تعلیم (Peace and Education Foundation) نے تیار کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باقی مجہول اداروں کے نام محض حاشیہ آرائی کے لیے دیے گئے ہیں تاکہ پردے کے پیچھے اصل کردار سامنے نظر نہ آئے کیونکہ اُس کردار کے کارنامے جو ہم نے سطورِ بالا میں بیان کیے ہیں اور جن کو جناب انصار عباسی نے روزنامہ جنگ اور روزنامہ دی نیوز میں طشت ازبام کیا تھا، اس قابل نہیں تھا کہ اُسے نمایاں کیا جاتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ملک کے معروف ترین 26 علماءِ کرام نے جو اُٹھتے بیٹھتے امریکہ کی ریشہ دوانیوں کے خلاف بولتے رہتے ہیں کس طرح امریکہ کے اسلام دشمن ادارے "یو ایس کمیشن فار انٹرنیشنل ریلجس فریڈم" اور اس سے فنڈنگ لینے والے ادارے پیس ُاینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن‘ کی چکا چوند روشنی سے آنکھیں خیرہ کرتے ہوئے تحسین کے ڈونگرے برسائے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جناب محمد اسرار ابن مدنی اور مولانا محمد اخونزادہ بطور فرنٹ مین استعمال ہوئے اور جید علماءِ کرام نے اپنے ان عزیزانِ گرامی پر اعتماد کرتے ہوئے کلماتِ تحسین عطا فرمائے۔

اب ہم آتے ہیں مذکورہ کتاب کے مندرجات کی طرف:

اسلام دینِ امن ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں۔ اسلام میں جنگ، جہاد اور قتال کا حکم ہے اور وہ اس لیے کہ ظلم اور زیادتی کا استیصال ہو، حق کی راہ میں مزاحم قوتوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کیا جائے۔ عدل وانصاف قائم کیا جائے جس کے نتیجے میں ابدی امن قائم ہو جائے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد ہم کتاب کے مندرجات کی طرف آتے ہیں۔ پہلے چار ابواب بعنوان تنوع، اختلافِ رائے، امن اور سلامتی، تعمیر امن اور حل تنازعات، اسلامی اقدار اور اصول، جائز طور پر موضوعاتِ متعلقہ کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد کے ابواب بنیادی طور پر مغربی لٹریچر کا چربہ ہے جو تنازعات کا سدِ باب "Conflict Resolution" کے عنوان کے تحت مغرب اور امریکہ میں شائع شدہ کتب میں بکثرت موجود ہیں۔ ان ابواب میں بھی کہیں کہیں اسلام اور مقامی سوچ کا تڑکا لگایا گیا ہے جو کہیں تو بے جوڑ محسوس ہوتا ہے اور کہیں متعلق (Relevant) نظر آتا ہے۔ کتاب میں مشکل الفاظ کی بھرمار ہے اور زبان وبیان بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ کتاب کو Interactive بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مغربی اور امریکی ترجیحات کے مطابق کتاب میں صنفی معاملات، آزادیٔ اظہار رائے، عالم گیریت کے تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک مدرس کی حیثیت سے ہماری رائے یہ ہے کہ مذکورہ کتاب "مرتبین" کے مقصد امن کے حصول میں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہاں اتنا ہے کہ پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن (Peace and Education Foundaion) اور اس کی پشت پر کام کرنے والے ادارے "یو ایس کمیشن فار انٹرنیشنل ریلجس فریڈم" کے مذموم کام پر پردہ ڈالنے اور اسے کیموفلیج کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

ہم آخر میں جناب محمد اسرار ابن مدنی اور مولانا محمد اخونزادہ سے التماس کرتے ہیں کہ مغربی امریکی اداروں کی فنڈنگ کسی ثواب کی خاطر نہیں کرتے بلکہ آقایانِ ولی نعمت کے عالمی مقاصد کی تکمیل کے لیے کرتے ہیں جیسا کہ اس معاملہ میں سامنے آیا کہ ان محترم اور جید علماءِ کرام نے جو اُٹھتے بیٹھتے امریکی ریشہ دوانیوں کی مذمت کرتے ہیں اور اُن کا توڑ کرنے کے لیے دن رات مصروفِ جدو جہد رہتے ہیں وہ کس طرح مجہول اداروں اور مجہول مرتبین کی مرتبہ کتاب کی (غالباً محض اپنے دو عزیزانِ کرام پر اعتماد کرتے ہوئے) تحسین کی اور ان مجہول اداروں کو مزید ریشہ دوانیاں کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

ہم آخر میں حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتوں کو تجویز پیش کرتے ہیں کہ مختلف درجات کے اردُو، انگریزی اور اسلامیات کے نصابات میں طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا تصور جنگ اور امن متوازن طریقے سے پیش کریں نیز قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اسلام کا درست تصور دینی اور جدید تعلیمی اداروں کے نصاب کا حصہ بنائیں تو فرقہ واریت، شدت پسندی اور انتہا پسندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ حال ہی میں حکومت نے ایک اچھا اقدام کیا ہے کہ سکولوں میں بارہویں جماعت تک ترجمہ قرآن کی مکمل تعلیم دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کو نافذ کرنے کے لیے حکومت بھی اور حکومت سے باہر دینی طبقات بھی مل کر کوشش کریں اور اسے کامیاب بنائیں تو معاشرے میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ امن قائم ہوگا اور انتہا پسندی بھی ختم ہو جائے گی۔

---

(۲)

مدیر

امن کی تعلیم کی ضرورت مسلمانوں کو ہے یا امریکہ و یورپ کو؟

برادرم پروفیسر ملک صاحب نے کتاب ''تعلیم، امن اور اسلام'' پر بہت اچھا اور موثر تبصرہ کیا ہے۔ ہم اس پر صرف ایک بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہی امریکہ جو آج ہمیں اور ہمارے بچوں کو امن کی تعلیم دینے کے لیے سرمایہ خرچ کر رہا ہے کیوں ہمیں کچھ عرصہ پہلے تک (روسی) کافرون سے لڑنے کی تعلیم و ترغیب دینے پر سرمایہ خرچ کرتا تھا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اپنے مفادات کے لیے۔ پہلے اس نے ہمیں اپنے سب سے بڑے حریف (روس) کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا اور اب وہ چاہتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے جو ظلم اور دہشت گردی وہ کر رہا ہے، مسلمان اس کی مزاحت نہ کریں لہٰذا وہ ہمیں اور ہمارے بچوں کو

امن کی تعلیم دینا چاہتا ہے۔

عراق، افغانستان، لیبیا، شام، یمن، نائجیریا، کشمیر، فلسطین اور پاکستان میں جو کچھ وہ خود کررہا اور اپنے حلیفوں کے ذریعے کرارہا ہے، کل جب وہ ہمیں کچل کر غلام بنارہا تھا اور مسلمان مزاحمت کررہے تھے تو اُس وقت بھی اسے سرسید، امیر علی، غلام احمد قادیانی جیسے لوگ مل گئے تھے۔ آج بھی اسے جاوید غامدی اور مولانا وحیدالدین خاں جیسے لوگ ملے ہوئے ہیں اور اپنی این جی اوز کے ذریعے وہ ہمارے کم عقل اور لالچی لوگوں کو ساتھ ملا کر اور علماء کا نام استعمال کر کے ہمیں امن کی تعلیم دینا چاہتا ہے تاکہ مسلمانوں میں فکری انتشار پھیلے۔ وہ جہاد کو دہشت گردی قرار دیتا ہے تاکہ مسلمانوں کا ذہن مغرب کی دہشت گردی اور انتہا پسندی کی طرف نہ جائے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ملک کا دفاع کریں تو یہ عین جہاد ہے اور اگر مسلمان معاشرے میں کچھ دہشت گرد اور انتہا پسند واقعتاً پیدا ہو بھی گئے ہیں تو یہ امریکہ و یورپ کے ظلم و بربریت اور اس کی دہشت گردی وانتہا پسندی کے ردّعمل میں ہوا ہے یا ان کے بہکاوے پر کچھ لوگ ان کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اصل اور بڑے دہشت گرد اور انتہا پسند تو امریکہ و یورپ ہیں نہ کہ مسلمان۔ لہٰذا امن کی تعلیم ان کو دینی چاہیے نہ کہ ہمیں۔ لیکن ہمارے بعض کم عقل اور لالچی لوگ امریکی سرمایہ اور پروپیگنڈے سے مات کھا جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اقبال نے آج سے اسّی (۸۰) سال پہلے کہا تھا۔

باطل کے کرّوفر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ ، یورپ سے در گزر

کس قیامت کے یہ نامے　　مدیر

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے

ہمیں البرہان پر دو تبصرے موصول ہوئے ہیں:

۱۔ مارچ ۲۰۱۷ء کے 'فکرونظر' (ذرا نم ہو تو یہ مٹی) پر ایک ایڈوکیٹ صاحب نے جو غازی ممتاز قادری شہیدؒ کو ظالموں سے بچانے والی ٹیم کے ایک رکن تھے، ہماری لاعلمی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ جسٹس شوکت عزیز صدیقی صاحب تو وہی جج ہیں جنہوں نے غازی ممتاز قادریؒ کو ہائی کورٹ میں پھانسی کی سزا سنائی تھی اور سیرت وسنت کے بارے میں انتہائی متنازعہ اور بودے ریمارکس دیے تھے (جن پر ملی مجلس شرعی کا تجزیہ وتنقید مطبوعہ موجود ہے) ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پھر اب جسٹس صاحب کی کایا کیسے پلٹ گئی ہے؟

انہوں نے خندۂ استہزاء سے جواب دیا کہ نوکری بچانے کی ایک کوشش ہے۔ ہم نے وضاحت کی درخواست کی تو کہنے لگے کہ موصوف کے خلاف کیس سپریم جوڈیشل کونسل میں ہے جس میں ذرائع کے مطابق جان ہے تو.....

۲۔ اسلامی ذہن کے ایک سینئر پروفیسر صاحب نے البرہان میں تعلیم پر سید مودودیؒ کے اس مضمون کے نشر مکرر پر جس میں انہوں نے جدید تعلیم کی درس گاہوں کو باصرار قتل گاہیں کہا تھا، پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے یہ مضمون شائع کر کے ہمارے زخم ہرے کر دیے ہیں؟ ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ تو کہنے لگے کہ تاریخ کی اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ جس سید مودودیؒ نے ان درس گاہوں کو قتل گاہیں کہا تھا، آج انہی کے پیروکار ایسی ہزاروں قتل گاہیں بنا اور چلا رہے ہیں۔

اور مزید منافقت یہ کہ اس کے باوجود وہ حکومت سے، اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے بھی کرتے رہتے ہیں۔